الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

اپنے حق سے زیادہ چاہنا ________

اپنے آپ کو اپنے واقعی حق سے بھی محروم کر لینا ہے

فروری ۱۹۸۷ شمارہ ۱۲۳

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحیدالدین خاں کے قلم سے

اللہ اکبر	40/-
تذکیر القرآن جلد اوّل	80/-
الاسلام	25/-
مذہب اور جدید چیلنج	25/-
ظہورِ اسلام	25/-
احیاءِ اسلام	20/-
پیغمبرِ انقلاب	30/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
صراطِ مستقیم	25/-
اسلامی زندگی	20/-
اسلام اور عصرِ حاضر	20/-
دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	6/-
تجدیدِ دین	4/-
اسلام دینِ فطرت	4/-
تعمیرِ ملت	4/-
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	6/-
عقلیاتِ اسلام	4/-
فسادات کا مسئلہ	2/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	2/-
تعارف اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	4/-

ایمانی طاقت	4/-
اتحادِ ملت	4/-
سبق آموز واقعات	4/-
زلزلۂ قیامت	5/-
حقیقت کی تلاش	4/-
پیغمبرِ اسلام	4/-
حقیقتِ حج	4/-
آخری سفر	4/-
اسلامی دعوت	4/-
خدا اور انسان	4/-
حل یہاں ہے	6/-
سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	4/-
حیاتِ طیبہ	4/-
باغِ جنت	4/-
نارِ جہنم	4/-
تبلیغی تحریک	12/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-
عظمتِ قرآن	25/-

Muhammad: The Prophet of Revolution	50/-
The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad: The Ideal Character	4/
Man Know Thyself	4/-

مکتبہ الرسالہ سی - ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۲۳ فروری ۱۹۸۷

فہرست

دنیا کا قانون

گائے دودھ دیتی ہے۔ یہ ہر آدمی جانتا ہے۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو یہ سوچتے ہوں کہ گائے کیسے دودھ دیتی ہے۔ گائے دودھ جیسی چیز دینے کے قابل صرف اس وقت بنتی ہے جب کہ وہ گھاس کو دودھ میں کنورٹ (تبدیل) کر سکے۔ گائے جب اس انوکھی صلاحیت کا ثبوت دیتی ہے کہ وہ کم تر چیز کو اعلیٰ چیز میں تبدیل کر سکتی ہے، اسی وقت یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ خدا کی دنیا میں دودھ جیسی قیمتی چیز فراہم کرنے والی بنے۔

یہی حال درخت کا ہے۔ درخت سے آدمی کو دانہ اور سبزی اور پھل ملتا ہے۔ مگر ایسا کب ہوتا ہے۔ ایسا اس وقت ہوتا ہے جب کہ درخت اس صلاحیت کا ثبوت دے کہ اس کے اندر مٹی اور پانی ڈالا جائے اور اس کو وہ تبدیل کر کے دانہ اور سبزی اور پھل کی صورت میں ظاہر کرے۔ درخت کے اندر ایک کم تر چیز داخل ہوتی ہے اور اس کو وہ اپنے اندرونی میکانزم کے ذریعہ تبدیل کر دیتا ہے اور اس کو برتر چیز کی صورت میں باہر لاتا ہے۔

یہی معاملہ انسانی زندگی کا بھی ہے۔ زندگی بھی اسی قسم کا امتحان ہے۔ موجودہ دنیا میں انسان کے ساتھ بھی یہی ہوتا ہے کہ اس کو محرومیوں سے سابقہ پڑتا ہے، اس کو ناخوش گوار حالات پیش آتے ہیں۔ یہاں دوبارہ انسان کی کامیابی یہ ہے کہ وہ اپنے ناموافق حالات کو موافق حالات میں تبدیل کر سکے۔ وہ اپنی ناکامیوں کے اندر سے کامیابی کا راستہ نکال لے۔

یہی دنیا کا قانون ہے، انسان کے لیے بھی اور غیر انسان کے لیے بھی۔ جو کوئی اس خاص صلاحیت کا ثبوت دے، وہی اس دنیا میں کامیاب ہے، اور جو اس صلاحیت کا ثبوت دینے میں ناکام رہے وہ خدا کی اس دنیا میں اپنے آپ کو ناکامی سے بھی نہیں بچا سکتا۔

خدا کی گائے گویا خدا کی مرضی کا اعلان ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ اس دنیا میں خدا کو ہم سے کیا مطلوب ہے۔ خدا کو ہم سے یہ مطلوب ہے کہ ہمارے اندر "گھاس" داخل ہو اور وہ "دودھ" بن کر باہر نکلے۔ لوگ ہمارے ساتھ برائی کریں تب بھی ہم ان کے ساتھ بھلائی کریں۔ ہمارے ساتھ ناموافق حالات پیش آئیں تب بھی ہم ان کو موافق حالات میں تبدیل کر سکیں۔

تخلیقی اقلیت

آرنلڈ ٹائن بی (۱۸۵۲ - ۱۹۸۳) ایک انگریز مورخ ہے۔ ۱۹۵۴ میں اس نے اپنی مشہور کتاب تاریخ کا مطالعہ (A Study of History) چھاپی۔ یہ کتاب بارہ جلدوں میں ہے۔ اور اس میں ۲۱ تہذیبوں کا فلسفیانہ مطالعہ کیا گیا ہے۔

اس کتاب میں ٹائن بی نے دکھایا ہے کہ کسی قوم کا ابھرنا اس پر منحصر نہیں ہوتا کہ وہ کسی اعلیٰ نسل سے ہے یا زیادہ بہتر جغرافی حالات اسے حاصل ہو گئے ہیں۔ بلکہ اس کا انحصار کسی قوم کی اس صلاحیت پر ہے کہ پیش آمدہ چیلنج کا جواب وہ کس طرح دیتی ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اس دنیا میں ہمیشہ وہ قومیں ابھرتی ہیں جو خصوصی مشکلات پیدا ہونے کے وقت خصوصی جدوجہد کر سکیں۔ تہذیبوں کے ابھرنے کے بارے میں ٹائن بی کی توجیہات اس نظریہ پر قائم ہیں کہ جو چیز لوگوں کو تہذیبی کامیابی حاصل کرنے کے قابل بناتی ہے وہ مشکل حالات ہیں نہ کہ آسان حالات:

> The rise of a civilization was not the result of such factors as superior racial qualities or geographical environment but rather as a people's response to a challenge in a situation of special difficulty that rouses them to make an unprecedented effort. Difficult rather than easy conditions prompted men to cultural achievement (4/659).

ٹائن بی کا کہنا ہے کہ تہذیب ہمیشہ کوئی تخلیقی اقلیت (Creative Minority) پیدا کرتی ہے۔ یہ دراصل چیلنج کا جواب دینے کا عمل (Challenge-response mechanism) ہے جو کسی قوم کو ابھارتا ہے اور اس کو دنیا کا امام بناتا ہے۔ بالفاظ دیگر اس دنیا میں محروم ہونا کوئی ناپسندیدہ بات نہیں۔ کیوں کہ محرومی آدمی کے اندر پانے کا جذبہ ابھارتی ہے۔ اور اس طرح اس کو زیادہ باعمل بنا کر اس کے لیے زیادہ بڑی کامیابی کا امکان پیدا کر دیتی ہے۔ مشکل حالات میں گھری ہوئی ایک قوم اگر رد عمل کی نفسیات میں مبتلا ہو تو وہ اپنے حالات سے صرف فریاد و احتجاج کی غذا لے گی۔ اور اگر وہ حالات سے اوپر اٹھ کر مثبت طور پر سوچے تو اس کو نظر آئے گا کہ اس کے مشکل حالات اس کو نئی شاندار تر کامیابی کا زینہ فراہم کر رہے ہیں۔

اس کے باوجود

۱۱ نومبر ۱۹۸۶ کی صبح کو میرے ساتھ ایک "حادثہ" پیش آیا۔ میری عینک ایک بھول کی وجہ سے پتھر کے فرش پر گر پڑی۔ اس کا شیشہ ٹوٹ گیا۔ تھوڑی دیر کے لیے مجھے جھٹکا لگا۔ پھر میں نے سوچا کہ اس دنیا میں تو ہمیشہ یہی ہوگا کہ یہاں پتھر کا فرش بھی رہے گا اور نازک شیشہ بھی اس لیے اس دنیا میں حفاظت اس کا نام نہیں ہے کہ چیزیں کبھی نہ ٹوٹیں۔ اس دنیا میں حفاظت یہ ہے کہ ٹوٹنے کے باوجود ہم چیزوں کو محفوظ رکھ سکیں۔ محرومی کے درمیانی واقعات پیش آنے کے باوجود ہم اپنے آپ کو آخری محرومی سے بچائیں۔

گلاب کا پھول کتنا خوبصورت ہوتا ہے۔ اس کو پھولوں کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ مگر جس ڈالی میں گلاب کا نازک پھول کھلتا ہے، اسی ڈالی میں سخت کانٹے بھی لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ قدرت کا قانون ہے۔ ہمارے لیے ناممکن ہے کہ ہم پھول کو کانٹے سے جدا کر سکیں۔ ہمیں کانٹے کے باوجود پھول کو لینا ہوگا۔ ہم اس دنیا میں کانٹے کے بغیر پھول کو نہیں پا سکتے۔

یہ زندگی کا ایک سبق ہے جو فطرت کی خاموش زبان میں ہمیں دیا جا رہا ہے۔ یہ واقعہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں "باوجود" کا اصول کارفرما ہے۔ یہاں ناخوش گواریوں کے باوجود خوش گواری کو قبول کرنا پڑتا ہے، یہاں "نہیں" کے باوجود اس کو "ہے" میں تبدیل کرنا ہوتا ہے۔

یہی اس دنیا کا عام اصول ہے۔ یہاں کامیابی اس کا نام ہے کہ آدمی ناکامیوں کے باوجود کامیابی تک پہونچنے کا راستہ نکالے۔ یہاں تجارت یہ ہے کہ گھاٹے کے باوجود نفع حاصل کیا جائے۔ یہاں آگے بڑھنا یہ ہے کہ پیچھے ہٹنے کے واقعات پیش آنے کے باوجود آگے کا سفر جاری رکھا جائے۔ اس دنیا میں کھونے کے باوجود پانے کا نام پانا ہے۔ یہاں اتحاد صرف ان لوگوں کے درمیان قائم ہوتا ہے جو اختلاف کے باوجود متحد ہونے کا فن جانتے ہوں۔

چوٹی کے لوگ

امریکہ سے ۱۹۸۶ میں ایک کتاب چھپی ہے۔ اس کتاب کا نام چوٹی کے عمل کرنے والے (Peak Performers) ہے۔ اس کتاب میں جدید امریکہ کے ان لوگوں کا مطالعہ کیا گیا ہے جنھوں نے زندگی کے میدان میں ہیروانہ کردار ادا کیا۔ اس سلسلہ میں مصنف نے جو باتیں لکھی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ طاقتور مشن (Powerful mission) وہ چیز ہے جو آدمی کے اندر کوشش (Superior effort) کا جذبہ ابھارتا ہے اور اس کو خصوصی کامیابی (Exceptional achievement) کے درجہ تک پہونچاتا ہے۔

۱۹۶۷ میں امریکہ نے پہلا انسان بردار راکٹ چاند پر بھیجا تھا۔ راکٹ کی روانگی سے پہلے جو ماہرین اس منصوبہ کی تکمیل میں مشغول تھے، ان میں سے ایک شخص کا بیان ہے جو اس ٹیم میں کمپیوٹر پروگرامر کے طور پر شامل تھا۔ اس نے دیکھا کہ عمل کے دوران کچھ غیر معمولی بات پیدا ہو گئی۔ ہزاروں عورتیں اور مرد جو اس منصوبہ میں کام کر رہے تھے، وہ سب کے سب اچانک اعلیٰ انجام دینے والے (Super-achievers) بن گئے۔ وہ اتنا عمدہ کام کرنے لگے جو اس سے پہلے انھوں نے ساری عمر میں نہیں کیا تھا۔

۱۸ مہینے میں حیرت انگیز تیزی کے ساتھ کام مکمل ہو گیا۔ میں نے جاننا چاہا کہ ہم سب لوگ اتنا عمدہ کام کیوں کر رہے ہیں۔ میں نے مینیجر کے سامنے یہ سوال رکھا تو اس نے مشرقی جانب چاند کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ لوگ ہزاروں سال سے وہاں جانے کا خواب دیکھتے رہے ہیں۔ اور اب ہم اس کو واقعہ بنانے جا رہے ہیں:

People have been dreaming about going there
for thousands of years. And we're going to do it.

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کو سب سے زیادہ جو چیز متحرک کرتی ہے وہ یہ کہ اس کے سامنے کوئی بڑا مقصد آجائے۔ بڑا مقصد آدمی کی اندرونی صلاحیتوں کو جگاتا ہے۔ وہ آدمی کو ہر قسم کی قربانیوں پر آمادہ کرتا ہے۔ وہ ایک عام آدمی کو چوٹی کا آدمی بنا دیتا ہے۔

دینے کے بعد پانا

انگریزی کا مقولہ ہے کہ ہم دیتے ہیں تبھی ہم پاتے ہیں (In giving that we receive)
اس کی ایک مثال اکتوبر ۱۹۸۶ میں برطانیہ کی ملکہ کا چین کا دورہ ہے۔ یہ چین کے لیے برطانیہ کے کسی شاہی فرد کا پہلا تاریخی دورہ تھا۔ چین اور برطانیہ ایک سو سال سے ایک دوسرے کے روایتی رقیب بنے ہوئے تھے۔ اس دورہ سے برطانیہ کو یہ کامیابی حاصل ہوئی کہ چین کے ساتھ اس کا ایک بلین ڈالر سے زیادہ ($ 1.5 billion) سالانہ تجارت کا معاہدہ یقینی ہو گیا۔

پانے کا یہ معاملہ دینے کے بعد ہوا ہے۔ ٹائم میگزین (۱۷ اکتوبر ۱۹۸۶) نے اس دورہ کی رپورٹ دیتے ہوئے یہ بامعنی الفاظ لکھے ہیں:

> Her Majesty Queen Elizabeth II had long voiced a desire to visit the People's Republic of China. But as long as Britain ruled a piece of Chinese territory, the crown colony of Hong Kong, such a journey was impossible. The 1984 Sino-British agreement returning Hong Kong to China in 1997 provided the price of admission (p. 22).

ملکہ الزبتھ بہت عرصہ سے اس خواہش کا اظہار کر رہی تھیں کہ وہ چین جانا چاہتی ہیں۔ مگر جب تک برطانیہ چین کے ایک حصہ (ہانگ کانگ) کا حکمراں تھا اس قسم کا سفر ناممکن بنا رہا۔ ۱۹۸۴ میں چین۔برطانیہ معاہدہ ہوا جس کے مطابق برطانیہ ۱۹۹۷ میں ہانگ کانگ کو واپس کر دے گا۔ اس معاہدہ نے ملکہ برطانیہ کے چین میں داخلہ کی قیمت ادا کر دی۔

برطانیہ نے ہانگ کانگ کے معاملہ میں چین کے مطالبہ کو مان لیا۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوا کہ اس کے لیے چین میں تجارت کا وسیع دروازہ کھلے۔ اگرچہ ہانگ کانگ کو دوبارہ چین کے حوالے کرنا ایک بے حد سخت معاملہ تھا۔ ٹائم کے الفاظ میں، اس کا مطلب یہ تھا کہ برطانیہ کا ایک ہیرا اس کے تاج سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو جائے ـــــ یہی موجودہ دنیا کا قانون ہے۔ یہاں دوسروں سے لینے کے لیے دوسروں کو دینا پڑتا ہے۔ جو لوگ دیے بغیر یک طرفہ طور پر دوسروں سے لینا چاہتے ہوں، ان کے لیے موجودہ دنیا میں کچھ بھی پانا مقدر نہیں۔

برتر کامیابی

موجودہ دنیا میں اعلیٰ درجہ کا کام انجام دینے والا (Super achiever) بننے کے لیے کسی طلسماتی صلاحیت کی ضرورت نہیں۔ ایک اوسط درجہ کا آدمی بھی انتہائی اعلیٰ درجہ کی کارکردگی کا ثبوت دے سکتا ہے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ آدمی زندگی کی سادہ حقیقتوں کو جانے اور ان کو استعمال کرے۔ (ریڈرز ڈائجسٹ، اکتوبر ۱۹۸۶)

ایک امریکی مصنف نے باقاعدہ طور پر اس کی تحقیق کی۔ اس کا کہنا ہے کہ تجارت، سیاست اسپورٹ اور آرٹ کے میدان میں اس نے ۹۰ ممتاز افراد سے رابطہ قائم کیا۔ ان کی اکثریت نے ناکامی کو "غلط آغاز" کا نتیجہ قرار دیا۔ مایوسیاں ان کے لیے زیادہ طاقتور ارادہ کا سبب بن گئیں۔ حالات خواہ کتنے ہی خراب ہوں، اعلیٰ درجے کا کام انجام دینے والے ہمیشہ محسوس کرتے ہیں کہ یہاں کچھ نئے گوشے ہیں جن کو وہ دریافت کر سکتے ہیں۔ ان کے پاس ہمیشہ کوئی نیا تصور ہوتا ہے جس کا وہ دوبارہ تجربہ کریں:

> In a study of 90 leaders in business, politics, sports and the arts, many spoke of "false starts" but never of "failure". Disappointment spur greater resolve. No matter how rough things get, super-achievers always feel there are other avenues they can explore. They always have another idea to test.

اگر آپ ناکامی سے دوچار ہوں اور اس ناکامی کا ذمہ دار دوسروں کو قرار دیں تو آپ کے اندر عمل کا جذبہ ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ آپ صرف دوسروں کے خلاف احتجاج اور شکایت میں مشغول رہیں گے اور خود کچھ نہ کر سکیں گے۔ لیکن اگر آپ اپنی ناکامی کو خود اپنی غلط کارکردگی کا نتیجہ سمجھیں تو آپ کا ذہن نئی زیادہ بہتر تدبیر سوچنے میں لگ جائے گا۔ آپ سست پڑنے کے بجائے مزید پہلے سے زیادہ متحرک ہو جائیں گے۔ آپ از سرِ نو جدوجہد کر کے ہاری ہوئی بازی کو دوبارہ شاندار تر شکل میں جیتنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

ناکامی کی ذمہ داری خود قبول کیجیے۔ ایک تدبیر کارگر نہ ہو رہی ہو تو دوسری تدبیر کا تجربہ کیجیے۔ آپ یقیناً اعلیٰ کامیابی تک پہنچ جائیں گے۔

مقبول دین

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ جو شخص اسلام کے سوا کوئی اور دین چاہے گا تو وہ اس سے قبول نہیں کیا جائے گا اور قیامت میں وہ گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہوگا (ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ وھو فی الآخرۃ من الخاسرین)

عام طور پر اس کی تشریح یہ کی جاتی ہے کہ اسلام آخرت میں نجات کا ذریعہ اس لیے بنے گا کہ وہ سب سے کامل دین ہے۔ اس کا رسول سب سے افضل رسول ہے۔ اس کی کتاب سب سے زیادہ بابرکت کتاب ہے۔ آیت کی یہ تفسیر قرآنی تفسیر نہیں۔ یہ ایک مضبوط بات کو کمزور دلیل سے ثابت کرنا ہے۔

قرآن میں دوسرے مقام پر ہے کہ خدا اپنے بندوں پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں (ان اللہ لیس بظلام للعبید) مذکورہ تفسیر قرآن کے اس بیان کی تردید ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے انسانی نسل کے ایک حصہ اور دوسرے حصہ کے درمیان فرق کیا ہے پیغمبر آخر الزماں کے ظہور سے پہلے پیدا ہونے والوں کو اس نے کم تر درجہ کا دین دیا اور جو لوگ پیغمبر آخر الزماں کے ظہور کے بعد پیدا ہوئے ان کو برتر دین عطا فرمایا۔ یہ بات یقینی طور پر خدا کی شان کے خلاف ہے۔ خدا اپنی رحمت کی تقسیم میں کبھی ایسا امتیاز کرنے والا نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام نجات کا ذریعہ اس لیے ہے کہ اب وہی ایک محفوظ دین ہے۔ پچھلے دور میں آنے والے دین بھی اپنے زمانہ میں اتنا ہی مقبول دین تھے جتنا کہ اسلام آج مقبول دین ہے۔ مگر جب ان کی آسمانی کتابوں میں تحریف ہوگئی۔ ان کے حاملین نے ان میں کمی بیشی کر دی تو اب وہ خدا کی ہدایت کو جاننے کا مستند ذریعہ نہ رہے۔ اسلام مکمل طور پر ایک محفوظ دین ہے اس لیے وہ خدا کی ہدایت کو جاننے کا مستند ذریعہ ہے۔ یہی واحد وجہ ہے جس کی بنا پر پچھلے تمام دین بعد کے زمانہ میں رد کر دیئے گئے اور صرف اسلام ہدایت کے ذریعہ کی حیثیت سے باقی رہا۔

اسلام اور دوسرے ادیان میں اصلی فرق یہ ہے کہ اسلام محفوظ ہے اور دوسرے ادیان غیر محفوظ۔

یہ فرق

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو یہ تعلیم دی کہ اپنے مخالفوں سے کہو کہ میں اپنے رب کی طرف سے ایک روشن دلیل پر ہوں اور تم نے اس کو جھٹلا دیا (قل انی علی بینۃ من ربی وکذبتم بہ، الانعام ۵۷) اس سے معلوم ہوا کہ پیغمبر اس دنیا میں دلیل کی بنیاد پر کھڑا ہوتا ہے، اس کے برسرِ حق ہونے کا ثبوت واضح دلیل ہوتی ہے نہ کہ محض ادعا۔

دوسری طرف قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ: اور کفر کرنے والوں نے کہا کہ اس قرآن کو نہ سنو اور اس میں خلل ڈالو تاکہ تم غالب آجاؤ (وقال الذین کفروا لاتسمعوا لھذا القرآن والغوا فیہ لعلکم تغلبون، حم السجدہ ۲۶) اس آیت کی تفسیر میں حسب ذیل روایت آئی ہے:

قال الضحاکؒ عن ابن عباس (والغوا فیہ) عیبوہ (تفسیر ابن کثیر)

ضحاک راوی ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس نے کہا کہ والغوا فیہ کا مطلب یہ ہے کہ اس کو عیب لگاؤ۔

جو لوگ کسی بات کو دلیل سے رد نہ کر پائیں اور وہ اس کو ماننے کے لیے بھی تیار نہ ہوں، تو اس کے بعد وہ تعییب کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ یعنی طرح طرح کے عیب لگا کر اس کو بدنام کرنا۔ پیغمبروں کے مخالفین ہر زمانہ میں اپنے پیغمبروں کے ساتھ ایسا ہی کرتے رہے ہیں۔

کہنے والے کے الفاظ کو اگر کمی بیشی کے بغیر اس کی اصلی صورت میں نقل کیا جائے اور پھر اس کو عقلی یا نقلی دلیل سے رد کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ تنقید ہے، اور تنقید عین جائز ہے۔ لیکن اگر کہنے والے کے الفاظ کو اس کی اصلی صورت میں نقل کیے بغیر اس پر بے دلیل مخالفانہ ریمارک دیا جائے تو یہ تعییب ہے، اور تعییب سراسر ناجائز ہے۔

جب ایک شخص دلیل کی زبان میں کلام کرے، اور اس کے مخالفین اس کے برعکس عیب جوئی اور الزام تراشی کی زبان بول رہے ہوں تو یہ فرق اس بات کا ثبوت ہے کہ شخصِ مذکور بلاشبہ حق پر ہے اور اس کے مخالفین بلاشبہ ناحق پر۔ کیوں کہ قرآن کے مطابق دلیل کی زبان پیغمبروں کی زبان ہے۔ اور عیب جوئی کی زبان اہلِ کفر کی زبان۔

شکایت

شکایت ایسی چیز ہے جس کی کوئی حد نہیں ۔ نہ صرف عام انسان بلکہ پیغمبروں کے بارہ میں بھی بڑی بڑی شکایتیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ حتیٰ کہ نعوذ باللہ خود خدا بھی شکایتوں سے مستثنیٰ نہیں ۔بے شمار لوگ ہیں جو اپنی مصیبتوں کے لیے خدا کی شکایت کرتے رہتے ہیں۔ فلسفہ میں ایک مستقل بحث ہے جس کو بگاڑ کا مسئلہ (Problem of evil) کہا جاتا ہے ۔ اس کے دعویدار کہتے ہیں کہ یا تو خدا کا وجود نہیں ہے ۔ اور اگر خدا ہے تو وہ کامل معیار والا نہیں۔ خدا اگر کامل معیار والا ہوتا تو دنیا میں بگاڑ کیوں ہوتا۔

شکایت کبھی واقعہ ہوتی ہے اور کبھی محض شکایت کرنے والے شخص کے اپنے ذہن کا نتیجہ ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ جب تم کسی کے خلاف کوئی بات سنو تو اس کی تحقیق کرو (الحجرات ٦) تحقیق سے معلوم ہو جائے گا کہ وہ بات صحیح تھی یا صحیح نہ تھی۔

شکایت کی بہت سی قسمیں ہیں۔ ان میں سب سے بری قسم وہ ہے جو احساس کمتری کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے۔ ایک شخص اپنے کو بطور خود بڑا سمجھ لیتا ہے۔ اب اگر اس کا سابقہ کسی ایسے شخص سے پڑے جس کو خدا نے اس سے اوپر کر دیا ہو تو یہ اول الذکر شخص کے لیے بڑا سخت لمحہ ہوتا ہے۔ عام طور پر وہ تسلیم نہیں کر پاتا کہ دوسرا شخص بڑا ہے اور وہ چھوٹا۔ وہ اپنی بڑائی کے ٹوٹنے کو برداشت نہیں کر پاتا۔ اس کی شخصیت پھٹ جاتی ہے وہ اپنی بڑائی کو باقی رکھنے کے لیے دوسرے شخص کو غلط ثابت کرنا شروع کر دیتا ہے ۔

وہ اس پر جھوٹا الزام لگاتا ہے۔ وہ اس کی تحقیر کرتا ہے تاکہ اپنے جذبۂ برتری کی تسکین حاصل کرے ۔ وہ اس کی عزت پر حملہ کرتا ہے تاکہ اس کو بے عزت کر کے اپنی متکبرانہ نفسیات کو غذا فراہم کرے۔ وہ خود ساختہ طور پر طرح طرح کی باتیں نکال کر اس کو چھوٹا ظاہر کرتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے یہ اطمینان حاصل کر سکے کہ وہ بڑا ہے ہی نہیں ۔آدمی اگر حقیقتِ واقعہ کے اعتراف کے لیے تیار رہے تو تمام شکایتوں کی جڑ کٹ جائے ۔ آدمی چوں کہ حقیقت کا اعتراف نہیں کرتا ، اس لیے وہ اپنے آپ کو شکایت سے اوپر اٹھانے میں بھی کامیاب نہیں ہوتا۔

ایک حقیقت

ایک " مولوی صاحب " بستی میں آئے اور لوگوں کے سامنے تقریر کی۔ انھوں نے پہلے یہ کیا کہ لوگوں کو نماز روزہ کی فرضیت کی طرف توجہ دلائی۔ اس کے بعد اپنے مدرسہ کے لیے چندہ کی اپیل شروع کر دی۔ تقریر ختم ہوئی تو لوگ خاموشی سے اٹھ اٹھ کر چلے گیے۔ غالباً کوئی شخص بھی نہ تھا جس کے اندر یہ ارادہ جاگا ہو کہ آئندہ وہ نماز روزہ کی پابندی کرے گا اور رسول اللہ کی سنت کے مطابق زندگی گزارے گا۔

سامعین میں سے ایک شخص کسی قدر بے باک تھا۔ اس نے کھڑے ہو کر کہا: مولوی صاحب، جب آپ کو مدرسہ کا چندہ ہی مانگنا تھا تو سیدھے سیدھے مانگا ہوتا۔ پھر آپ کو وعظ و تبلیغ کا ڈھونگ رچانے کی کیا ضرورت تھی۔ مولوی صاحب نے اگرچہ قرآن وحدیث سنایا تھا اور نماز روزہ کے بارہ میں شریعت کا حکم بتایا تھا۔ مگر جب انھوں نے اسی کے ساتھ اس میں چندہ کا مطالبہ بھی شامل کر دیا تو سننے والے کی نظر میں ان کی تقریر صرف چندہ کا مطالبہ بن کر رہ گئی۔ نماز روزہ کی تبلیغ کی حیثیت سے ان کی تقریر کی اہمیت ختم ہوگئی۔ اپنے نزدیک انھوں نے نماز روزہ کی اپیل کی، مگر سننے والوں کے نزدیک وہ صرف چندہ کی اپیل تھی اور بس۔

آج اس طرح کے بے شمار سفیر ہمارے مدرسوں اور دار العلوموں کی طرف سے مقرر ہیں۔ وہ روزانہ بستیوں بستیوں میں جاتے ہیں اور وہاں لوگوں کے سامنے تقریریں کرتے ہیں۔ مگر ہر شخص اچھی طرح جانتا ہے کہ ان سفیر صاحبان کی تقریروں سے کسی شخص کے اندر بھی دینی انقلاب نہیں آیا۔ کسی کے اندر بھی نماز روزہ کی زندگی پیدا نہیں ہوئی۔

اس کے برعکس مثال تبلیغی جماعت کی ہے۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ تبلیغی جماعت کی کوششوں سے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں لوگ نمازی بن گیے۔ اور بے دینی کو چھوڑ کر دینی زندگی گزارنے لگے۔ اس فرق کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ مدرسوں کے سفیر ایک طرف دینی تقریر کرتے ہیں اور دوسری طرف چندہ کی اپیل کرتے ہیں۔ وہ دینے والے

بھی ہیں اور" مانگنے والے" بھی۔ جب کہ تبلیغی جماعت چندہ کی کوئی بات نہیں کرتی۔ وہ صرف دیتی ہے، وہ مانگتی نہیں۔

یہی فرق ہے جس کی بنا پر مدرسوں کے سفیر ناکام ہیں اور تبلیغ کے لوگ کامیاب۔ جب آپ کسی کے سامنے دینے والے اور مانگنے والے دونوں بن کر جائیں تو اس کو آپ صرف مانگنے والے نظر آئیں گے، دینے والے کی حیثیت سے آپ کی تصویر اس کی نظر میں اوجھل ہو جائے گی۔

تبلیغی جماعت نے جو طریقہ مسلمانوں کے سلسلہ میں اختیار کیا وہی طریقہ غیر مسلموں کے سلسلہ میں بھی لازمی طور پر ضروری ہے۔ اگر ہمیں غیر مسلموں کو" قرآن" دینا ہے تو اس سے پہلے ہمیں اپنی تمام مانگوں کو چھوڑنا ہوگا۔ آج ہمارے تمام لیڈر غیر مسلموں کے مقابلہ میں احتجاج اور حقوق طلبی کی مہم چلا رہے ہیں۔ خدا کے پیغمبر اپنی مخاطب قوموں سے کہتے تھے کہ لا اسئلکم علیہ من اجر (میں اس پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا) اس کے برعکس مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ اسئلکم علیہ من اجر (میں اس پر تم سے اجر کا طالب ہوں) کی تصویر بنے ہوئے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر کوئی مسلم رہنما یہ کرے کہ وہ ایک ہاتھ سے وزیر اعظم کو شکایات اور مطالبات کا میمورنڈم دے اور دوسرے ہاتھ سے قرآن کا ایک نسخہ بھی انھیں پیش کر دے تو یہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک مذاق ہوگا نہ کہ خدا کی کتاب کو غیر مسلم حکمراں تک پہونچانا۔

اگر ہم واقعۃً دعوت کے معاملہ میں سنجیدہ ہوں تو ہم کو اول مرحلہ میں یہ جان لینا چاہیے کہ دوسری قوموں تک خدا کے دین کا پیغام پہونچانے کے لیے ہمیں خدائی اخلاقیات کی سطح پر آنا پڑے گا۔ یعنی یک طرفہ عمل کے ذریعہ انھیں خدا کے دین رحمت کا مخاطب بنانا، بغیر اس کے کہ کسی بھی معاملہ میں ہم ان کے خلاف احتجاج کر رہے ہوں، یا ان کے ساتھ حقوق طلبی کی مہم میں مشغول ہوں۔

یہ دنیا مقابلہ کی دنیا ہے۔ اس لیے یہ قدرتی بات ہے کہ اس دنیا میں ہمارے کچھ مادی اور تہذیبی مسائل ہوں۔ لیکن اگر ہمیں خدا کے یہاں داعی کا کریڈٹ لینا ہے تو ہمیں اپنے

مسائل کا ذمہ دار خود اپنے آپ کو قرار دینا ہوگا۔ ہمیں اپنے مسائل کو اپنی داخلی کوششوں کے ذریعہ حل کرنا ہوگا نہ یہ کہ ایک یا دوسری وجہ بتا کر ہم اپنی مدعو اقوام کے خلاف مطالباتی مہم شروع کر دیں۔

غیر مسلموں تک اسلام کا پیغام پہونچانے کے لیے، ہمیں ان کے مقابلہ میں وہی کرنا ہوگا جو مسلمانوں کے سلسلہ میں تبلیغی جماعت کر رہی ہے۔ یعنی یک طرفہ قربانی کے ذریعہ ان کے سامنے بالکل بے غرض بن جانا۔ اگر ہم اس ملک میں "مانگنے والے" بنے ہوئے ہوں تو عین اسی وقت ہم انھیں "دینے والے" نہیں بن سکتے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو غیر مسلموں کے لیے بھی اتنا ہی صحیح ہے جتنا مسلمانوں کے لیے۔

اصل یہ ہے کہ ہر چیز کی ایک قیمت ہے، اسی طرح داعی بننے کی بھی ایک قیمت ہے۔ مسلمان ابھی تک اس ملک میں داعی نہیں بنے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے ابھی تک اس کی قیمت ادا نہیں کی۔ داعی بننے کی قیمت کیا ہے۔ وہ قیمت یہ ہے کہ آدمی مدعو کی نظر میں آخری حد تک بے غرض بن جائے، خواہ اس کے لیے اسے کتنی ہی بڑی قربانی دینی ہو اور اسے کچھ بھی برداشت کرنا پڑے۔ مدعو کی نظر میں اس کی ایک ہی تصویر ہو۔ اور وہ داعی کی تصویر ہو۔ مدعو کی نظر میں داعی کا مقام حاصل کرنے کے لیے وہ یک طرفہ طور پر مدعو سے اپنے تمام قومی اور مادی جھگڑے ختم کر دے۔

مدعو سے قومی نزاع کھڑی کرنا، مدعو سے مادی مطالبات کرنا، حتیٰ کہ تہذیبی تشخص حاصل کرنے کے نام پر مدعو کے مقابلہ میں احتجاج کی مہم چلانا، یہ سب دعوتی مصالح کے سراسر خلاف ہے۔ یہ سب وہ چیزیں ہیں جو داعی اپنے داخلی عمل کے زور پر حاصل کر سکتا ہے۔ اور جس چیز کا حصول خود اپنے عمل کے ذریعہ ممکن ہو اس کے لیے مدعو سے احتجاج و مطالبہ کی مہم چلانا دعوتی شریعت میں جائز نہیں۔ ایسا ہر فعل دعوت کے امکانات کو ذبح کرنے کے ہم معنی ہے۔ جو لوگ ایسی سرگرمیوں میں مشغول ہوں وہ نہ اللہ کی نگاہ میں داعی قرار پا سکتے ہیں اور نہ بندوں کی نگاہ میں۔

مصنوعی مسائل

کیلی فورنیا کے ایک کروڑ پتی رابرٹ گراہم (Dr Robert Graham) نے ایک انوکھا بینک قائم کیا۔ اس کا نام انھوں نے نوبیل اسپرم بینک (Nobel Spermbank) رکھا۔ اس "بینک" میں نوبیل انعام یافتہ افراد کے مادۂ منویہ کو حاصل کرکے محفوظ کیا جاتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے عورتوں کو بارآور کیا جائے اور زیادہ اعلیٰ ذہانت (Above-average intelligence) والے بچے پیدا کیے جائیں۔ بانی کا کہنا تھا کہ یہ بینک اس نے نااہل شوہروں (Infertile husbands) کے لیے قائم کیا ہے۔ تاہم جدید خواتین کی اباحیت پسندی اس پابندی کو ختم کر رہی ہے۔ بہت سی خواتین نکاح کے بغیر بچہ پیدا کرنا چاہتی ہیں، نیز وہ چاہتی ہیں کہ ان کی اولاد اعلیٰ استعداد کی مالک ہو۔ ایسی خواتین آزادانہ طور پر اس بینک کی خدمات حاصل کر رہی ہیں۔

انھیں خواتین میں سے ایک کیلی فورنیا کی ڈاکٹر آفٹن بلیک (Afton Blake) ہے۔ اس کی عمر اس وقت ۴۴ سال ہے۔ اس نے مذکورہ نوبیل اسپرم بینک سے رابطہ قائم کیا۔ وہ اپنے لیے جس قسم کی اولاد چاہتی تھی، اس کے مطابق اسے مشورہ دیا گیا کہ وہ نمبر ۲۸ (Number 28) کا مادہ حاصل کرے۔ واضح ہو کہ اس بنک میں جن لوگوں کے مادۂ منویہ جمع کیے گیے ہیں ان کو ان کے نام سے پکارا نہیں جاتا۔ بلکہ ان میں سے ہر ایک کو ایک نمبر دیا گیا ہے اور اسی خاص نمبر سے اس کو یاد کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر بلیک "نمبر ۲۸" کے مادہ کو اپنے رحم میں داخل کرکے حاملہ ہوئی۔ مقررہ وقت پر اس کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اس لڑکے کا نام اس نے ڈورون (Doron) رکھا۔ یہ یونانی لفظ ہے جس کے معنی تحفہ یا عطیہ کے ہوتے ہیں۔ یہ بچہ اب چار سال سے زیادہ کا ہو چکا ہے اور وہ اب اسکول جانے لگا ہے۔ اس کی تصویر ہندستان ٹائمس، ۷ ستمبر ۱۹۸۶ (میگزین صفحہ ۴) پر شائع ہوئی ہے۔ ڈیلی ٹیلی گراف کا نمائندہ آئن بروڈی (Ian Brodie) مذکورہ خاتون سے اس کے لاس اینجلس (کیلی فورنیا) کے مکان پر ملا۔ اس کی رپورٹ کے مطابق ڈاکٹر بلیک کی خوشیاں دھیرے دھیرے غم میں تبدیل ہو رہی ہیں۔ باپ کے بغیر بچہ کی ولادت اس کے لیے طرح طرح

کے مسئلے پیدا کر رہی ہے۔ ان مسائل کی طویل فہرست میں سے ایک یہ ہے کہ نومولود اب بولنے لگا ہے۔ وہ بار بار پوچھتا ہے کہ میرے باپ کہاں ہیں۔ ڈاکٹر بلیک نے بتایا کہ ایک بار ایسا ہوا جب کہ ڈورون مجھ سے غصہ ہو گیا۔ اس نے کہا کہ وہ باہر جا رہا ہے تاکہ وہ اپنے باپ کے ساتھ رہے:

There was one occasion when Doron got angry with me. He said he was going off to live with his dad.

خاتون کے لیے شوہر کے بغیر اولاد حاصل کرنا پہلے ایک دلچسپ تجربہ معلوم ہوتا تھا، مگر اب وہ نازک مسائل کا ایک سلسلہ نظر آتا ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ نومولود ڈورون اپنے لیے ایک باپ سے محروم ہے:

One thing Doron is deprived of is a Daddy.

وحی والہام

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اللہ نے شہد کی مکھی کو وحی کی (وَاَوْحیٰ رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جانوروں میں بعض ایسی نشانیاں ہیں جو وحی سے مشابہت رکھتی ہیں۔ ان کا مطالعہ وحی الٰہی کے معاملہ کو انسان کے لیے قابل فہم بنا دیتا ہے۔

وحی کے عقیدہ کا مطلب خارجی ذریعہ علم سے رہنمائی کا آنا ہے۔ جانوروں کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ان کے درمیان اس قسم کا ذریعہ علم واضح طور پر موجود ہے۔ جانوروں میں ایسی صفات پائی جاتی ہیں جن کی توجیہہ اس کے سوا کچھ اور نہیں کی جا سکتی کہ یہ مانا جائے کہ ان کو اپنے باہر سے ہدایات مل رہی ہیں۔ انہیں صفات میں سے ایک صفت جانوروں کی مہاجرت (Migration) کا معاملہ ہے۔ خاص طور پر مچھلیوں اور چڑیوں کی مہاجرت اپنے اندر ایسی نشانیاں رکھتی ہے جس کے بعد وحی والہام کے معاملہ کو سمجھنا کچھ بھی مشکل نہیں رہتا۔

یہاں ہم مہاجر چڑیوں (Migratory birds) کا حوالہ دیں گے۔ بہت سی چڑیاں ہیں جو خوراک کی تلاش میں یا موسم کی تبدیلی کی بنا پر ایسا کرتی ہیں کہ خاص خاص وقتوں میں اپنے اصل مقام سے ہجرت کر کے دوسرے موزوں تر مقامات پر جاتی ہیں اور پھر ایک خاص مدت کے بعد دوبارہ اپنے سابق مقام پر واپس آجاتی ہیں۔

ان پروازوں کے بارہ میں موجودہ زمانہ میں نہایت وسیع مشاہدات کیے گیے ہیں۔ ان سے معلوم ہوا ہے کہ یہ پروازیں بے مقصد اڑان کی حیثیت نہیں رکھتیں۔ بلکہ ایک ماہر طیور کے الفاظ میں ان کی حیثیت نہایت اعلیٰ درجہ کے جغرافی بندوبست (Geographical arrangement) کی ہے۔ وہ اتنا ہی بامعنی ہیں جتنا کسی انسان کا سوچا سمجھا ہوا سفر بامعنی ہوتا ہے۔ نیز مشاہدات کے ذریعہ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ یہ پروازیں انتہائی صحیح طور پر مقرر راستوں (Well-defined flyways) پر انجام پاتی ہیں۔

چڑیوں کا یہ سفر نہایت عجیب ہے۔ انسان کے لیے صحیح طور پر ایک مقام سے دوسرے مقام پر جانا اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ اس نے راستہ اور منزل کی پوری معلومات خارج

سے حاصل کرلی ہوں۔ یہ "خارجی ذریعہ" انسان کے لیے دوسروں سے سنتا یا دوسروں کی تحقیق کو پڑھنا یا خود بیرونی احوال کا تجربہ کرنا ہے۔ اگر انسان کو تاریخی طور پر جمع شدہ معلومات سے، آپس کے تبادلۂ خیال سے، یا تعلیم گاہوں کی تعلیم سے کاٹ دیا جائے تو انسان کچھ بھی نہ کر سکے۔

مثال کے طور پر الادریسی نے زمین کے گول ہونے کا ابتدائی تصور ہندی نظریہ عرین (Arin) سے لیا۔ پھر الادریسی کی کتاب کا لاتینی ترجمہ پڑھ کر یہ فکر کولمبس تک پہونچا۔ پھر کولمبس کے تجربات سے بعد والوں کے علم میں اضافہ ہوا۔ یہ سلسلہ ایک کے بعد ایک اسی طرح بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ جغرافیہ کا علم ترقی کے اس درجہ تک پہونچا جو آج کے انسان کو حاصل ہے۔ آج جب سمندری جہاز کا ایک کپتان وسیع سمندر میں داخل ہو کر اس ساحل سے اُس ساحل تک اپنا جہاز لے جاتا ہے۔ یا ہوائی جہاز کا پائلٹ ایک براعظم سے اڑ کر دوسرے براعظم میں اترتا ہے تو اس عمل کے پیچھے سیکڑوں سال کے انسانی تجربات کا علم شامل ہوتا ہے۔

چڑیاں اس طرح کا کوئی ذریعہ علم نہیں رکھتیں۔ وہ اس قسم کے ذریعہ معلومات سے مکمل طور پر کٹی ہوئی ہیں۔ چڑیوں کے اندر باہم تبادلۂ خیال نہیں ہوتا جس طرح انسانوں کے اندر ہوتا ہے۔ اس بنا پر چڑیوں کے لیے یہ ممکن نہیں کہ ایک چڑیا دوسری چڑیا کے تجربات سے فائدہ اٹھا کر اپنی معلومات کو بڑھائے۔ کوئی چڑیا اپنی معلومات کو کتاب کی صورت میں قلم بند نہیں کرتی کہ دوسری چڑیا اس کو پڑھ کر اس سے رہنمائی حاصل کرے۔ اس قسم کی ہر سہولت سے کامل محرومی کے باوجود یہ چڑیاں بالکل انسانوں کی مانند سفر کرتی ہیں۔ وہ اس درجہ صحت کے ساتھ ایک مقام سے دوسرے مقام تک جاتی ہیں جیسے کہ ریڈیائی کنٹرول کے ذریعہ کوئی راکٹ خلا میں چلایا جا رہا ہو۔

مہاجر چڑیوں کا مطالعہ کرنے والے ایک محقق نے لکھا ہے کہ چڑیوں کی ہجرت کی پروازیں متعین راستوں پر ہوتی ہیں۔ بعض اوقات لمبے فاصلوں پر حد درجہ عمدہ تعین کے ساتھ:

The migration flights of birds follow specific routes, sometimes quite well defined over long distances (12/181).

افریقہ میں چڑیوں کی مہاجرت کا جو انداز ہے اس میں انوکھا انضباط پایا جاتا ہے۔ مثلاً بعض چڑیاں

جو ایک مخصوص حلقہ میں گھونسلے بناتی ہیں جو خط استوا پر مغرب میں سینیگال اور مشرق میں کینیا تک پھیلا ہوا ہے ، وہ خاص وقتوں میں شمال کی طرف ہجرت کر جاتی ہیں تاکہ وہ بارش کے موسم سے بچ سکیں :

The migratory behaviour of birds has a unique regularity in Africa. The standard-wing night jar, which nests in a belt extending from Senegal in the west to Kenya in the east along the equatorial forest, migrates northward to avoid the wet season (12/180).

اگلے صفحہ پر ہم ایک نقشہ دے رہے ہیں ۔ یہ نقشہ چڑیوں کے بین براعظمی سفر کو بتا رہا ہے ۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ روس اور دوسرے یورپی علاقوں کی چڑیاں کس طرح سرد موسم میں اپنے علاقے سے نکل کر افریقہ اور ایشیا کے گرم علاقوں کی طرف جاتی ہیں ۔ اس لمبے سفر میں انھیں تین سمندروں سے واسطہ پیش آتا ہے ـــــ انھیں کیسپین سمندر (Caspian Sea) اور بحر اسود (Black Sea) اور بحر متوسط (Mediterranean Sea) کو پار کرنا پڑتا ہے ۔ یہ چڑیاں ایسا نہیں کرتیں کہ بے خبری کے عالم میں بس اپنے مقام سے اڑ کر کسی طرف بھی روانہ ہو جائیں ۔ اس مقصد کے لیے وہ نہایت صحت کے ساتھ اس رخ کا تعین کرتی ہیں جو ان کے لیے موزوں ترین ہے ۔ وہ نہایت صحت کے ساتھ عین وہ راستے اختیار کرتی ہیں جدھر سے جانے میں انھیں کم سے کم سمندر کے اوپر سے گزرنا پڑے ۔ کیوں کہ خشکی پر بوقت ضرورت وہ نیچے اتر سکتی ہیں مگر سمندر میں اترنا ان کے لیے ممکن نہیں ۔

اس نقشہ کو دائیں سے بائیں کی طرف دیکھئے ۔ اس میں چڑیوں کا پہلا جھنڈ وہ ہے جو یورپ سے آتے ہوئے وہاں پہونچتا ہے جہاں ان کی راہ میں بحر کیسپین حائل ہے ۔ یہاں وہ مڑ جاتی ہیں وہ بحر کیسپین کو کنارے چھوڑتے ہوئے ایک طرف قراقرم کی جانب سے اور دوسری طرف کاکیشیا کی جانب سے پرواز کر کے ایشیا میں داخل ہوتی ہیں اور اپنے مطلوبہ مقامات پر اتر جاتی ہیں ۔

یہ چڑیاں ٹھیک یہی معاملہ بحر اسود کے ساتھ بھی کرتی ہیں ۔ چنانچہ ان کا جھنڈ یہاں پہونچ کر دو ٹکڑے ہو جاتا ہے ۔ ان کا ایک حصہ بحر اسود کے مغربی ساحل سے اور دوسرا حصہ مشرقی ساحل سے اپنا سفر جاری رکھتا ہے ۔ یہاں تک کہ وہ ایشیائی علاقہ میں داخل ہو جاتا ہے ۔



Principal routes taken by the European white stork (*Ciconia ciconia*) between nesting grounds in Europe and wintering grounds in Africa.

ایک ماہر طیور نے لکھا ہے کہ یہ بخوبی طور پر الگ الگ راستے غالباً چڑیوں نے اس لیے اختیار کیے ہیں کہ وہ سمندر کے اوپر لمبی پرواز سے بچ سکیں :

These well-separated routes are probably a result of the stork's aversion to long flights over water (12/180).

اس کے بعد چڑیوں کے تیسرے جھنڈ کا منظر ہے۔ یہ چڑیاں بلغاریہ تک آکر ترکی کی طرف مڑجاتی ہیں۔ پھر شام، لبنان اور فلسطین کے سواحل کا تتبع کرتے ہوئے وہ سوئز تک پہونچتی ہیں۔ یہاں سے وہ مصر کی سرزمین میں داخل ہوتی ہیں اور پھر آگے افریقی علاقوں میں چلی جاتی ہیں۔

چڑیوں کا چوتھا جھنڈ یونان کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ جس کی خشکی لمبی نوک کی مانند بہت دور تک سمندر کے اندر چلی گئی ہے۔ یہ چڑیاں یونان اور کریٹ کی خشکی کا سہارا لیتے ہوئے سمندر میں داخل ہوتی ہیں۔ یہ سمندر کا وہ مقام ہے جو سب سے کم چوڑا ہے۔ وہ اپنے طویل سفر میں سمندر کو عین اس نقطہ پر عبور کرتی ہیں جہاں جغرافی طور پر اس کی چوڑائی سب سے کم ہوجاتی ہے۔ چڑیاں اس راستہ کو واضح طور پر اس لیے اختیار کرتی ہیں کہ انھیں کم سے کم سمندر کے اوپر پرواز کرنا پڑے۔ یعنی عین وہی وجہ جس کی بنا پر قدیم زمانہ میں انسانی قافلے بیچ سمندر میں اپنی کشتی ڈالنے کے بجائے "آبنائے" کے مقام پر سمندروں کو عبور کیا کرتے تھے۔

چڑیوں کا پانچواں جھنڈ وہ ہے جو آگے بڑھ کر اٹلی کے راستے پر مڑجاتا ہے۔ وہ اٹلی کے اوپر پرواز کرتے ہوئے سسلی میں داخل ہوتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے دائیں اور بائیں سمندر کو چھوڑتا ہوا لمبا راستہ خشکی کے اوپر اوپر طے کرتا ہے اور پھر سسلی کے ساحل سے سمندر میں داخل ہوکر افریقہ میں پہونچ جاتا ہے۔ دوبارہ عین اسی مقام پر جہاں سمندر کی چوڑائی سب سے کم تھی

چڑیوں کا چھٹا جھنڈ اس نقشہ میں فرانس کی طرف جاتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور پھر وہ اسپین کی طرف مڑکر خشکی کے اوپر اڑتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ جبرالٹر کے پاس پہونچ جاتا ہے۔ جہاں وسیع سمندر صرف دس میل چوڑا رہ جاتا ہے۔ یہ چڑیاں سمندر کو عبور کرنے کے لیے اس

موزوں ترین مقام کا انتخاب کرتی ہیں۔ وہ یہاں پہونچ کر سمندر میں داخل ہوتی ہیں اور آبنائے جبرالٹر کو پار کر کے افریقہ کی زمین پر اتر جاتی ہیں۔ 1

چڑیوں کے یہ اسفار انتہائی حد تک حیرت انگیز ہیں۔ آج کا ایک انسان جب اس قسم کا طویل سفر کرتا ہے تو وہ بہت سے علوم سے مدد لیتا ہے۔ مگر چڑیوں کے اندر نہ انسانی ذہن ہے اور نہ علوم سے مدد لینے کا انتظام۔ پھر چڑیاں کیوں کر اس قسم کے پیچیدہ اسفار میں کامیاب ہوتی ہیں، ایک ماہر طیور نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا ہے:

Birds have evolved a highly efficient means for travelling swiftly over long distances with great economy of energy (12/179).

چڑیوں نے نہایت اعلیٰ درجہ کے ارتقا یافتہ موثر ذریعے دریافت کر لیے ہیں تاکہ وہ لمبے فاصلوں پر کم سے کم طاقت خرچ کر کے بخوبی سفر کر سکیں۔ مگر یہ محض الفاظ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ چڑیوں کے اندر یا ان کے حالات میں ہرگز ایسے شواہد موجود نہیں ہیں جو یہ ثابت کریں کہ چڑیوں نے کسی ارتقائی عمل کے ذریعہ یہ صلاحیت اپنے اندر پیدا کی ہے۔

گہرائی کے ساتھ غور کیجئے تو اس معاملہ کی توجیہہ کے لیے دو ہی ممکن مفروضے ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ان چڑیوں کو یورپ اور ایشیا اور افریقہ کے جغرافیہ کا اور اس کی خشکی اور تری کا مکمل علم حاصل ہو۔ مگر کوئی بھی تحقیق ایسا ثابت نہیں کرتی۔ ہماری تمام معلومات کے مطابق چڑیاں بذاتِ خود کسی بھی قسم کے جغرافی علم سے قطعاً نابلد ہیں۔ اس مفروضہ کو ثابت کرنے کے لیے جو کچھ کہا جاتا ہے وہ محض بے بنیاد قیاس ہے جس کے حق میں کوئی علمی شہادت موجود نہیں۔

اس کے بعد دوسرا ممکن مفروضہ صرف یہ ہے کہ کوئی "واقفِ جغرافیہ" ان کی رہنمائی کر رہا ہو۔ یہاں کوئی مخفی قسم کا ریموٹ کنٹرول ہو جو چڑیوں کو ٹھیک اسی طرح مسلسل رہنمائی دے رہا ہو جیسے ہمارے غیر انسان بردار راکٹ کو ریڈیائی کنٹرول کے ذریعہ دور سے رہنمائی دی جاتی ہے۔ یہی دوسری صورت زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ واقعہ اس عقیدہ کو پوری طرح قابلِ فہم بنا دیتا ہے جس کو آسمانی مذہب میں وحی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

جانوروں کی زندگی میں ایسے واقعات ہیں جن کی توجیہہ اس کے بغیر نہیں ہوتی کہ مانا

جائے کہ ان کو ایک خارجی خزانۂ علم سے رہنمائی مل رہی ہے ۔ اسی کا نام مذہبی زبان میں وحی ہے ۔ جانوروں کی زندگی کا مطالعہ وحی کے معاملہ کو قابلِ فہم بنا دیتا ہے ۔ اور قرآن کے ذریعہ کسی چیز کا قابلِ فہم ہونا ہی کافی ہے کہ اس کی واقعیت و صداقت پر یقین کیا جائے ۔

وحی کے عقیدہ کا مطلب یہ ہے کہ خدا اپنے مخفی ذریعہ سے ایک انسان پر اپنی رہنمائی بھیجتا ہے ۔ یہ رہنمائی بتاتی ہے کہ انسان کو کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے ۔ خدا اور بندہ (پیغمبر) کے درمیان وحی کا یہ اتصال بظاہر دکھائی نہیں دیتا ، اس لیے کچھ لوگ کہہ دیتے ہیں کہ ہم کیوں کر اسے مانیں ۔

مگر دوسری مخلوقات ، مثلاً مہاجر چڑیوں کے سفر کے معاملہ پر غور کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں "وحی" کی نوعیت کی رہنمائی موجود ہے ۔ ان چڑیوں کا حد درجہ صحت کے ساتھ سفر کرنا ایک ایسا واقعہ ہے جو وحی کے معاملہ کو ہمارے لیے قابلِ فہم بنا دیتا ہے ۔ کیوں کہ چڑیوں کے ان اسفار کی کوئی بھی حقیقی توجیہہ اس کے سوا نہیں کی جاسکتی کہ یہ مانا جائے کہ ان کو خارج سے کوئی مخفی قسم کی رہنمائی مل رہی ہے ۔ جب چڑیوں کے اپنے اندر اس کے معلوم اسباب موجود نہیں ہیں تو اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس کو خارج سے آنے والی چیز قرار دیا جائے ۔

پیغمبر کا یہ دعویٰ کہ اس کو خدا کی طرف سے مخفی رہنمائی آتی ہے ، بلاشبہ عجیب ہے ۔ مگر اس قسم کی مخفی رہنمائی موجودہ کائنات میں عجیب نہیں ۔ یہاں دوسرے ایسے واقعات کثرت سے موجود ہیں جو اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ اس قسم کی رہنمائی کائنات میں بطور واقعہ موجود ہے ۔ مہاجر چڑیوں کا معاملہ ان بے شمار مثالوں میں سے صرف ایک مثال ہے جس کو نہایت مختصر طور پر یہاں بیان کیا گیا ہے ۔

نادانی کا کلمہ

اخبارات میں ایک کیس شائع ہوا ہے۔ یہ نادرہ بیگم قریشی کا کیس ہے۔ وہ بلاسپور (مہاراشٹر) کی رہنے والی ہے۔ اس کے شوہر نے ایک لڑکی کی پیدائش کے بعد اس کو طلاق دے دیا۔ اب وہ عدالت کے ذریعہ اپنے سابق شوہر سے گذارہ وصول کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

ٹائمس آف انڈیا یکم مئی ۱۹۸۶ کی رپورٹ کے مطابق جب نادرہ بیگم قریشی سے پوچھا گیا کہ وہ کیوں اندور کی شاہ بانو کے راستہ پر چل رہی ہے اور فوجداری قانون کی دفعہ ۱۲۵ کے تحت اپنے لیے گذارہ وصول کرنا چاہتی ہے (جب کہ یہ اسلام کے خلاف ہے) تو اس نے تیزی سے جواب دیا کہ اسلام نے میرے لیے کیا کیا ہے کہ میں اس کے اصولوں کی پابندی کروں۔ نہ جج اور نہ وکیل اس میں کامیاب ہو سکے کہ وہ مسز قریشی کو اپنا مقدمہ واپس لینے پر راضی کر سکیں۔ اس نے مسٹر قریشی کی اس پیش کش کو بھی رد کر دیا کہ وہ اس کو اور اس کی لڑکی کو دوبارہ واپس لینے پر تیار ہیں۔ اس نے پیش کش کو ٹھکراتے ہوئے عدالت سے درخواست کی کہ وہ اس کو پانچ سو روپیہ ماہوار گذارہ دلائے۔ مسز شاہ بانو کے برعکس وہ ابھی جوان (۳۰ سال) ہے اور اس نے بی اے تک تعلیم حاصل کی ہے۔

"What has Islam done for me that I should follow its tenets? shoots back Mrs Nadira Begum Qureshi when asked why she is following in the footsteps of Mrs Shah Bano of Indore and seeking maintenance allowance under Section 125, Cr. P.C. Neither the judge nor lawyers could persuade Mrs Qureshi to withdraw her case. She rejected Mr Qureshi's offer to take her and her daughter back. The offer rejected, she called upon the court to get her Rs 500 a month as allowance. Unlike Mrs Shah Bano, she is young (30) and educated (Graduate).

یہ ایک نادان عورت کا کلمہ ہے نہ کہ واقف کار عورت کا کلمہ۔ مذکورہ خاتون اگر تاریخ سے واقف ہوتی تو وہ جانتی کہ عورت کو جو کچھ ملا ہے اسلام ہی کے ذریعہ ملا ہے۔ حتی کہ ایک عورت کا کھڑے ہو کر یہ کہنا کہ "اسلام نے میرے لیے کیا کیا" یہ بھی اسلام ہی کا عطیہ ہے۔ اسلام سے پہلے عورت کو یہ درجہ ہی حاصل نہ تھا کہ وہ بر سر عام اس طرح آزادی کا کلمہ کہہ سکے۔

سنت کے خلاف

جنوری ۱۹۸۷ کا واقعہ ہے۔ شہر کی ایک بس ایک بڑی مسلم تعلیم گاہ کے سامنے سے گذری۔ اتفاق سے ایک مسلمان طالب علم بس کی زد میں آگیا اور اس کے نیچے دب کر ہلاک ہو گیا۔ حادثہ کی خبر سن کر تعلیم گاہ کے مسلم طلبہ وہاں آئے تو ڈرائیور بھاگ چکا تھا۔ البتہ بس سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ طلبہ نے بس کو آگ لگادی۔ مزید انھوں نے یہ کیا کہ جو بس ادھر سے گذرتی اس کو روکتے اور آگ لگاتے۔ آگ بجھانے کے لیے فائر بریگیڈ کے لوگ آئے تو ان کو پتھر مار کر بھگا دیا۔ پولیس آئی تو انھوں نے پولیس پر بھی پتھر مارنے شروع کیے۔

اب پولیس کی باری تھی۔ پولیس غصہ میں بے قابو ہو کر طالب علموں کے اوپر ٹوٹ پڑی۔ اس کے پاس ہتھیار تھے۔ اس نے نہ صرف یہ کیا کہ سڑک پر کھڑے ہوئے طالب علموں کو مارا بلکہ وہ ہاسٹل میں اور تعلیم گاہ کے کمروں میں گھس گئی۔ اس نے سیکڑوں طالب علموں کو مار مار کر بری طرح زخمی کر دیا۔ وغیرہ۔

اس طرح کے واقعات ہندستان میں پچھلے ۴۰ سال سے مسلسل پیش آرہے ہیں۔ ان کی شکلیں مختلف ہو سکتی ہیں مگر کہانی سب کی ایک ہے۔ ایسا ہر واقعہ ہمیشہ مسلمانوں کی کسی اشتعال انگیز کارروائی سے شروع ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ مسلمانوں کے شدید جانی و مالی نقصان پر ختم ہوتا ہے۔ چھوٹے بڑے تمام واقعات کو شمار کیا جائے تو چالیس سال میں ان کی تعداد ۴۰ ہزار تک پہونچ چکی ہوگی۔ جب بھی ایسا واقعہ ہوتا ہے تو مسلمانوں کے تمام اصاغر اور اکابر بلا استثنار یہ کرتے ہیں کہ وہ یک طرفہ طور پر پولیس اور انتظامیہ کو برا بھلا کہتے ہیں۔ کوئی ایک بھی قابل ذکر شخص ایسا نہیں جو اس طرح کے معاملات میں مسلمانوں کو سمجھائے اور انھیں تنبیہہ کرے۔

ہمارے یہ تمام لیڈر بلاشبہہ سنت کے خلاف عمل کر رہے ہیں۔ اور حدیث کے مطابق، ہر بات جو سنت کے خلاف ہو وہ بدعت ہے۔ اور ہر بدعت کا آخری انجام تباہی ہے۔ پچھلی نصف صدی سے مسلمان جو کچھ بھگت رہے ہیں وہ سنت سے اسی انحراف کا نتیجہ ہے۔ مسلمانوں کا مذکورہ عمل سنت سے انحراف کیوں ہے، اس کو سمجھنے کے لیے ایک حدیث کا مطالعہ کیجئے:

قال الامام احمد حدثنا عمرو بن عاصم عن   حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

حماد بن سلمة عن علی بن زید عن الحسن عن جندب عن حذیفة عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال : لاینبغی لمسلم ان یذل نفسہ۔ قیل وکیف یذل نفسہ۔ قال : یتعرض من البلاء لما لایطیق۔ وکذا رواہ الترمذی وابن ماجہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کسی مسلمان کے لیے مناسب نہیں کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل کرے۔ پوچھا گیا کہ کیسے کوئی شخص خود اپنے کو ذلیل کرے گا۔ آپ نے فرمایا کہ وہ ایسی بلا کا سامنا کرے جس سے نپٹنے کی اسے طاقت نہ ہو۔

اس حدیث کی روشنی میں دیکھئے تو مذکورہ قسم کے واقعات میں پولیس یا اکثریتی فرقہ کی شکایت کرنا سراسر غیر مسنون فعل ہے۔ ایسا ہر واقعہ خود اپنی غیر اسلامیت کی داستان ہے نہ کہ اغیار کے ظلم کی داستان۔ کیوں کہ اس ملک میں مسلمان جب اقلیت میں ہیں اور جب یہ معلوم ہے کہ مسلمانوں کی متشددانہ کارروائی کے بعد پولیس آئے گی۔ اور موجودہ حالت میں یہ بھی معلوم ہے کہ پولیس جب آئے گی تو وہ یک طرفہ طور پر مسلمانوں کی مار پیٹ کرے گی اور مسلمان اس کو ہرگز روک نہ سکیں گے۔ ایسی صورت میں مذکورہ قول رسولؐ کے مطابق، مسنون طریقہ یہ ہے کہ مسلمان ابتدائی اشتعال کا واقعہ نہ کریں۔ وہ ایسے آغاز سے اپنے آپ کو بچائیں جس کے متعلق معلوم ہے کہ اس کا انجام لازمی طور پر ان کے خلاف نکلے گا۔

حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ مومن ایک بل سے دو بار نہیں ڈسا جاتا۔ (المومن لایلدغ من جحر مرتین) مگر مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ایک ہی بل میں وہ روزانہ ہاتھ ڈالتے ہیں اور ہر روز اس سے ڈسے جاتے ہیں۔ کسی نادان شخص نے بھڑ کے چھتہ میں صرف ایک بار ہاتھ ڈالا ہوگا۔ مگر مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ روزانہ بھڑ کے چھتہ میں ہاتھ ڈال رہے ہیں اور روزانہ اس کا انجام بھگت رہے ہیں۔ کیا اس کے باوجود ان کا یہ دعویٰ درست ہو سکتا ہے کہ اسلام کو وہ اپنا دین سمجھتے ہیں۔ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا رسول مانتے ہیں۔ دین اور رسول کا مفہوم اگر وہی ہو جو لغت کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے تو ان کا دعویٰ درست نہیں۔ اور اگر مسلمانوں کا اپنا کوئی علیحدہ لغت ہو جس میں انھوں نے بطور خود ان الفاظ کا کوئی دوسرا مفہوم لکھ رکھا ہو تو البتہ ان کا دعویٰ درست ہو سکتا ہے۔ مگر مسلمانوں کو جاننا چاہیے کہ ایسے کسی لغت کی قیمت ان کے اپنے نزدیک خواہ کتنی ہی زیادہ ہو، خدا اور خلق کے نزدیک اس کی کوئی قیمت نہیں۔

ایک سفر

پہلی قسط

مذہبی آزادی کی عالمی کونسل (The World Council on Religious Liberty) کا صدر دفتر نیویارک (امریکہ) میں ہے۔ اس کے زیر اہتمام ۱۳۔ ۱۵ اکتوبر ۱۹۸۶ کو جنیوا (سوئزر لینڈ) میں ایک بین اقوامی کانفرنس ہونے والی تھی۔ اس کا ابتدائی دعوت نامہ (مورخہ ۱۹ اگست ۱۹۸۶) مجھے پہلے ملا تھا۔ مگر اس وقت جنیوا کا سفر کرنا میرے لیے ممکن نہ تھا۔ اس لیے میں اس دعوت نامہ کو قبول نہ کرسکا اور معذرت نامہ لکھ کر بھیج دیا۔

میں اپنی مشغولیتوں میں اس کانفرنس کو بھول چکا تھا کہ نومبر کے تیسرے ہفتہ میں رات کے وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ رسیور اٹھایا تو معلوم ہوا کہ مذکورہ ادارہ کے ذمہ دار نیویارک سے بول رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ بعض اسباب سے کانفرنس کی تاریخیں ملتوی ہوگئی تھیں۔ اب یہ کانفرنس ۷۔ ۹ دسمبر ۱۹۸۶ کو جنیوا میں ہو رہی ہے۔ کیا آپ اس میں شرکت کر سکتے ہیں۔ ان کو بتایا گیا کہ اس کا جواب ہم آپ کو چند دن کے بعد دے سکیں گے۔ چنانچہ ۱۷ نومبر کو دوبارہ ان کا ٹیلی فون آیا تو میں نے شرکت کے لیے رضامندی دیدی۔ اس کے بعد نیویارک سے بار بار ان کے ٹیلی فون آتے رہے۔ چوں کہ وقت کم تھا، وہ کانفرنس کی تمام تفصیلات ٹیلی فون پر بتاتے رہے۔

ان کا ٹیلی فون اکثر نصف شب کو آتا تھا۔ وہ خود اگرچہ دن کے " ۱۲ بجے " ٹیلی فون کرتے تھے۔ مگر وہ ہم کو رات کے " ۱۲ بجے " وصول ہوتا تھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہاں سے یہاں تک ٹیلی فون کے پہونچنے میں ۱۲ گھنٹہ لگتا تھا۔ ٹیلی فون تو دنیا کے کسی بھی حصہ میں ایک سکنڈ سے بھی کم مدت میں پہونچ جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جس وقت امریکہ میں نصف دن (دوپہر) کا وقت ہوتا ہے، اس وقت ہندستان میں نصف شب کا وقت ہوتا ہے۔ وہ اپنے لحاظ سے دن کے " ۱۲ بجے " ٹیلی فون کرتے تھے۔ مگر دہلی میں ہم کو ان کا ٹیلی فون رات کے " ۱۲ بجے " ملتا تھا۔ ایک ملک اور دوسرے ملک میں وقت کا یہ فرق دراصل زمین کی محوری گردش کے سبب سے پیدا ہوتا ہے۔

دعوت نامہ کی اطلاع تو ٹیلی فون پر مل گئی۔ مگر اب دوسرا مسئلہ سوئزرلینڈ ایمبیسی سے ویزا حاصل کرنے کا تھا۔ مگر ان کا اصول یہ ہے کہ وہ ویزا صرف اس وقت دیتے ہیں جب کہ آدمی کے پاس تحریری دعوت نامہ اور ہوائی جہاز کا ٹکٹ موجود ہو۔ اب اتنا وقت نہیں تھا کہ دعوت نامہ اور ٹکٹ معمول کی ڈاک سے روانہ کیا جائے۔ موجودہ تیز رفتار دنیا میں اس کا حل بھی تلاش کر لیا گیا ہے۔

چنانچہ انھوں نے ہوائی جہاز کا ٹکٹ پی ٹی اے (Prepaid Ticket Advice) کے ذریعہ بھیجا جو کمپیوٹر پر اگلے دن آ گیا۔ اور فوری خطوط کے لیے موجودہ زمانہ میں ایک نظام قائم کیا گیا ہے جس کو کورئیر سروس (Courier Service) کہا جاتا ہے۔ اس میں خطوط یا ٹکٹ محکمہ ڈاک کے حوالے کرنے کے بجائے براہ راست ہوائی جہاز کے ذریعہ بھیجے جاتے ہیں اور منزل پر اس کی ایجنسیاں پیکٹ کو وصول کر کے مکتوب الیہ کے دفتر میں دستی طور پر پہونچا دیتی ہیں۔ اس طرح نیویارک سے چلا ہوا خط ہم کو تین دن کے اندر ۲۵ نومبر کو دہلی میں وصول ہو گیا۔

دعوت نامہ کے ساتھ مجھ کو "جنرل انفارمیشن" کے جو کاغذات ملے تھے اس میں درج تھا:

Participants holding U.S. passports do not need a visa.

یعنی کانفرنس کے جو شرکار امریکہ کا پاسپورٹ رکھتے ہوں ان کے لیے ویزا کی ضرورت نہیں۔ "ہندستان" جیسے ملک کے لوگ جب باہر نکلتے ہیں تو ان کو ایک عجیب قسم کے بین اقوامی امتیاز کا تجربہ ہوتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں دنیا کی قومیں دو قسم کے طبقات میں بٹ گئی ہیں۔ ایک دینے والی، اور دوسری لینے والی۔ دینے والی قوم کے افراد جب کسی غیر ملک میں جاتے ہیں تو ان کو عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کو خوش آمدید کہا جاتا ہے۔ اس کے برعکس لینے والی قوم کا فرد جب کسی غیر ملک میں جاتا ہے تو اس کو توحش کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اول الذکر کے لیے نسبتاً نرم قوانین ہیں اور ثانی الذکر کے لیے نسبتاً سخت قوانین۔ یہ ایک عجیب المیہ ہے کہ ہندستان، اپنے بے شمار وسائل کے باوجود، ابھی تک دوسری قسم کے ممالک کی فہرست میں شامل ہے۔

اسی قسم کا ایک واقعہ جنیوا سے واپسی کے وقت ۱۰ دسمبر کو پیش آیا۔ روانگی کے وقت میں نے ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل (جنیوا) کے ریسپشن پر پوچھا کہ کیا یہاں سے جانے والے مسافروں پر کوئی ایرپورٹ ٹیکس ہے۔ ریسپشن کے آدمی نے مسکرا کر جواب دیا :

No Airport tax here, that's only in India.

اگرچہ ایسا نہیں کہ ایرپورٹ ٹیکس صرف ہندستان میں ہو، مگر ریسپشنسٹ نے جس معنی میں یہ بات کہی وہ صرف اس برصغیر کی خصوصیت ہے جس کا مجموعی نام ہندستان رہا ہے۔

دعوت نامہ کے ساتھ "جنرل انفارمیشن" کے جو کاغذات آئے تھے۔ ان میں دوسری باتوں کے ساتھ ایک ہدایت ان الفاظ میں درج تھی :

Please remember to bring a warm coat as you know Geneva in December can be rather cold.

یعنی براہ کرم ایک گرم کوٹ لانا یاد رکھیے، کیوں کہ آپ جانتے ہیں کہ جنیوا دسمبر میں کافی ٹھنڈا ہو سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ اس بات کی آگاہی تھی کہ آپ "گرم ملک" سے نکل کر "سرد ملک" میں جا رہے ہیں۔ اس ہدایت کو میں نے پڑھا تو مجھے یاد آیا کہ اسی قسم کی اس سے سخت تر آگاہی وہ ہے جو ہر روز موت کے ذریعہ دی جا رہی ہے۔ موت ہر انسان کو خاموش زبان میں بتاتی ہے کہ تم بہت جلد "اپنی دنیا" سے نکل کر "خدا کی دنیا" میں داخل ہونے والے ہو۔ پہلے انتباہ پر ہر آدمی چوکنا ہو جاتا ہے، مگر دوسرے انتباہ پر کوئی چوکنا ہونے والا نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی صورت میں آدمی گرم ملک اور سرد ملک دونوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ جب کہ دوسری صورت کا معاملہ یہ ہے کہ اپنی دنیا تو ہر آدمی کو براہ راست دکھائی دے رہی ہے، اور خدا کی دنیا کسی کو براہ راست دکھائی نہیں دیتی۔

ایک مسلمان سے اس سفر کا ذکر ہوا۔ انھوں نے کہا کہ "آپ جنوا جا رہے ہیں۔ جنوا میں تو مسلمانوں نے ایک زمانہ میں حکومت کی ہے" میں نے کہا کہ ایسا تو نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے حال میں ایک کتاب میں اس کو پڑھا ہے۔

اس کے بعد وہ ڈاکٹر انفضل اقبال (سابق پاکستانی سفیر) کی کتاب لائے

جس کا نام ہے (Islamization of Pakistan) اس کتاب میں فاطمی حکمرانوں کا ذکر کرتے ہوئے صفحہ ۱۰ پر یہ فقرہ تھا :

Sicily for a time acknowledged the Fatimid sovereignty extended over Genoa.

(سسلی نے ایک وقت میں فاطمیوں کا اقتدار تسلیم کیا جو جنوا تک پھیلا ہوا تھا) میں نے کتاب کو دیکھنے کے بعد کہا کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ ڈاکٹر افضل اقبال نے جنوا (Genoa) کا ذکر کیا ہے۔ یہ جنوبی اٹلی کا ایک شہر ہے۔ جب کہ میرا سفر جنیوا (Geneva) کے لیے ہو رہا ہے جو سوئزرلینڈ میں واقع ہے۔ یہ صحیح ہے کہ سسلی اور جنوبی اٹلی پر ایک زمانہ میں مسلمانوں کی حکومت رہی ہے۔ مگر سوئزرلینڈ میں کبھی ان کی باقاعدہ حکومت قائم نہیں ہوئی —— لفظی اشتراک سے بعض اوقات بڑی عجیب غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

دہلی سے سفر کا آغاز برٹش ایرویز کی فلائٹ نمبر ۲۰ سے ہوا۔ یہ جہاز ہانگ کانگ سے آتا ہے اور دہلی ہوتے ہوئے لندن جاتا ہے۔ "ہم ایک لمبی پرواز پر روانہ ہو رہے ہیں۔ ۹ گھنٹے کے بعد ہم لندن ایرپورٹ پر اتریں گے" اس اعلان کے ساتھ، دسمبر ۱۹۸۶ کی صبح کو ۳ بجے ہمارا جہاز فضا میں بلند ہوا۔ اس سفر کا بیشتر حصہ سوتے میں گزرا، اس لیے سفر کی تکان کا زیادہ احساس نہیں ہوا۔ نیند بھی اللہ تعالیٰ کی کیسی عجیب نعمت ہے۔ جو لوگ پاگل ہوتے ہیں، اکثر اس کا سبب یہی ہوتا ہے کہ ان کی نیند اڑ جاتی ہے۔ دنیا میں اگر سب کچھ ہو، صرف نیند اس سے اٹھالی جائے تو تمام انسان اپنا ذہنی توازن کھو دیں اور پوری دنیا ایک بہت بڑا پاگل خانہ بن کر رہ جائے۔

لندن ایرپورٹ سے اگلی فلائٹ پکڑنے کے لیے ٹرمنل نمبر ۱ پر جانا تھا۔ میں ایرپورٹ کی گاڑی سے روانہ ہوا تو وہاں میرے ساتھ چار آدمی اور بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ لوگ کسی مختلف زبان میں آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ میں نے پوچھا کہ آپ لوگ کون سی زبان بول رہے ہیں۔ انھوں نے جو جواب دیا وہ مجھے "جومن" سنائی دیا۔ پہلی بار میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ انھوں نے دہرایا تو میں سمجھا کہ وہ جرمنی کے رہنے والے ہیں اور جرمن زبان بول رہے

رہے ہیں۔

اسی کا نام لہجہ کا فرق ہے۔ ہر گروہ کا لہجہ الگ الگ ہوتا ہے۔ اس لیے الفاظ کی ادائگی میں ایک اور دوسرے کے درمیان فرق ہو جاتا ہے۔ اسی ایک لفظ کو کوئی جرمن کہتا ہے، کوئی جومن، کوئی جمن۔ مگر معنوی اعتبار سے سب کی مراد ایک ہوتی ہے۔ اسی کی روشنی میں اس حدیث کا مطلب سمجھا جا سکتا ہے جس میں آیا ہے کہ قرآن سات حرفوں میں اترا ہے۔ یہاں "سات" سے مراد تعدد ہے۔ یعنی الفاظ کی ادائگی (لہجہ) کے اعتبار سے قرأت قرآن کے کئی طریقے ہیں۔

یہ حدیث دراصل اسلام کی عالم گیریت کو بتاتی ہے۔ اس ارشاد سے رسول اللہؐ کا مطلب یہ تھا کہ اسلام صرف مذہبی پیشواؤں (کلرجی) کا مذہب نہ ہوگا اور نہ وہ کسی ایک قوم میں محدود رہے گا۔ وہ عمومی سطح پر پھیلے گا اور مختلف قبیلے اور قومیں اس کو قبول کریں گی۔ اس لیے بالکل قدرتی بات ہے کہ لہجات کے اختلاف کی وجہ سے اس کی ادائگی کے کئی طریقے ہو جائیں۔

لندن سے جنیوا کا سفر برٹش ایرویز کی فلائٹ نمبر ۶۲۲ کے ذریعہ ہوا۔ جہاز میں مشہور ہفتہ وار اکانومسٹ (The Economist) کا شمارہ ۶ دسمبر ۱۹۸۶ پڑھا۔ اس میں ایک مضمون ایران۔ عراق کے مسئلہ کے بارہ میں تھا۔ اڈیٹر نے مختلف وجوہ بتاتے ہوئے لکھا تھا کہ ایران کا مسئلہ مغرب کے لیے بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ ایران کے مقابلہ میں عراق کی انسانی طاقت صرف ایک تہائی ہے۔ اس لیے یہ بظاہر ناممکن ہے کہ عراق اس جنگ سے فاتح ہو کر نکلے۔ مزید یہ کہ جنگ ہمیشہ نہیں رہ سکتی۔ وہ کبھی نہ کبھی ختم ہوگی۔ آنے والے وقت کے پیش نظر مغرب کو ضرورت ہے کہ وہ ایران کے بارہ میں اپنی پالیسی پر ٹھنڈے طریقہ سے غور کرے:

That is why the west needs to be thinking coolly about an Iran policy.

زندہ لوگ دشمنی کے ساتھ دوستی کرنا بھی جانتے ہیں۔ جب کہ مردہ لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب وہ ایک رخ پر چل پڑیں تو اس سے پھرنا ان کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔

جہاز کے اندر برٹش ایرویز کا ماہانہ میگزین ہائی لائف (Highlife) تھا۔ اس

کے نیچے حسب معمول یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے :

Your personal copy to take away.

یہ دسمبر ۱۹۸۶ کا پرچہ تھا جو آرٹ پیپر کے ڈیڑھ سو صفحات پر نہایت عمدہ چھپا ہوا تھا۔ مگر وہ مفت دیا جا رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دراصل میگزین نہیں بلکہ ایک قسم کا اشتہار نامہ ہے۔ پورا پرچہ اشتہارات سے بھرا ہوا تھا۔ تاہم انھوں نے پرچہ پر "ہمارا تحفہ" کا لفظ نہیں لکھا، بلکہ "آپ کی اپنی کاپی" لکھا۔ یہ وہ تجارتی زبان ہے جو موجودہ زمانہ میں پیدا ہوئی ہے۔ جدید تجارتی اصول یہ ہے کہ "میں" کو حذف کر کے "آپ" کا استعمال کیا جائے ہر آدمی کو طبعاً اپنی ذات سے دلچسپی ہوتی ہے، دوسرے سے کسی کو دلچسپی نہیں ہوتی۔ تجارت کی کامیابی اسی نفسیات کو استعمال کرنے کا دوسرا نام ہے۔ ایک تاجر نے کہا کہ تجارت میں سب سے کم اہم لفظ "میں" ہے اور سب سے زیادہ اہم لفظ "آپ"۔

دنیا کا نقشہ اپنے سامنے رکھیے تو دہلی سے یورپ کی طرف جاتے ہوئے جنیوا پہلے نظر آئے گا اور لندن اس کے بعد۔ گویا دہلی سے لندن جا کر جنیوا آنے کے لیے ہمیں دوبارہ پیچھے کی طرف سفر کرنا پڑا۔

اس کی وجہ "کنکٹنگ فلائٹ" کا مسئلہ ہے۔ دہلی سے جنیوا کے لیے براہِ راست پرواز نہیں ہے۔ اگر آپ قریبی راستہ سے دہلی سے جنیوا کے لیے روانہ ہوں تو راستہ میں جہاں آپ جہاز بدلیں گے وہاں سے فوری طور پر آپ کو دوسرا جہاز نہیں ملے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ اگلے جہاز کے انتظار میں آپ کو درمیانی ہوائی اڈہ پر لمبی مدت تک پڑے رہنا ہوگا۔ مگر لندن دنیا کا سب سے بڑا ہوائی مرکز ہے۔ یہاں سے ہر جگہ کے لیے کم سے کم وقت میں جہاز مل جاتے ہیں۔ دہلی سے سیدھے راستہ کے ذریعہ جنیوا جانے میں ہمیں زیادہ وقت لگتا۔ جب کہ لندن کے راستے سے جانے میں نسبتاً کم وقت لگا۔ لینن نے کہا تھا کہ "ہندستان کا وہ راستہ قریب ہے جو لندن ہو کر جاتا ہے" اسی طرح ہمارے لیے جنیوا کا وہ راستہ زیادہ قریب تھا جو لندن ہو کر گیا ـــــ کبھی دور کا راستہ قریب ہوتا ہے، اور قریب کا راستہ دور ہو جاتا ہے۔

لندن میں شہر کے اندر جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ البتہ ہوائی جہاز میں اڑتے ہوئے پورے

لندن کا منظر صاف دکھائی دیا۔ لندن میں ۱۶۶۶ میں زبردست آگ لگی تھی۔ اس میں لندن کا دو تہائی حصہ جل کر راکھ ہوگیا تھا۔ ۸۷ گرجاگھر بالکل کھنڈر ہوگئے۔ اس کے بعد بعض ماہرین تعمیر نے یہ نقشہ بنایا کہ لندن کی نئی تعمیر میں اس کی سڑکیں زیادہ چوڑی کردی جائیں۔ مگر مالکان زمین کو معاوضہ دینے کے لیے اس وقت ضروری رقم حکومت کے پاس موجود نہ تھی۔ اس لیے اس منصوبہ پر صرف جزئی عمل ہوسکا۔ تاہم گرجاگھروں کی نئی تعمیر پر اہل لندن نے زبردست طاقت خرچ کی۔ سینٹ پال کے عظیم گرجاگھر کی تعمیر ثانی میں پورے ۳۵ سال لگ گئے۔ وہ ۱۷۱۱ میں دوبارہ بن کر مکمل ہوا۔ تاہم یہ تین سو سال پہلے کی بات ہے۔ آج کے لندن میں گرجا (چرچ) کے مقابلہ میں دوسری چیزیں زیادہ اہمیت اختیار کرچکی ہیں۔

تازہ اطلاعات کے مطابق برطانیہ میں ۰۰ ۵ ۷، ۱ سکھ آباد ہیں اور پورے ملک میں ان کے تقریباً ۱۵۰ گوردوارے ہیں۔ ہندو مذہب کو ماننے والوں کی تعداد ایک لاکھ ۵۰ ہزار سے کچھ زیادہ ہے۔ برطانیہ میں انھوں نے بھی تقریباً ۱۵۰ مندر بنائے ہیں۔ ہندو مراکز کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مذہبی رسوم کی ادائگی کے علاوہ سماجی اور تہذیبی خدمات بھی انجام دیتے ہیں۔

برطانیہ میں مسلمانوں کی آبادی تقریباً ۱۵ لاکھ ہے جس میں زیادہ تعداد پاکستان اور بنگلہ دیش کے باشندوں کی ہے۔ لندن ایرپورٹ کی ایک ملازم خاتون مجھے "مسلمان" صورت دیکھ کر مجھ سے مخاطب ہوئی۔ اس نے اپنا نام ماریہ بیگ بتایا۔ اس نے کہا کہ وہ اصلاً پرتگالی ہے۔ اس نے اسلام قبول کرکے مسٹر بیگ سے نکاح کرلیا ہے۔ مسٹر بیگ پاکستانی ہیں۔ اور لندن میں بحیثیت انجینیر کام کرتے ہیں۔ برطانیہ میں تقریباً ایک ہزار مسجدیں ہیں۔ لندن میں بہت بڑا اسلامک سینٹر اور مسجد ہے۔ اس کی شاندار تصویر الدعوۃ (ریاض) ۸ دسمبر ۱۹۸۶ کے ٹائٹل کے آخری صفحہ پر دیکھی جاسکتی ہے۔

۷ دسمبر کی دوپہر کو ہم جنیوا اتر گئے۔ یہاں ایرپورٹ پر ایک عجیب قصہ پیش آیا۔ توقع کے مطابق وہاں کانفرنس کے منتظمین کو ڈبلو سی آر ایل (WCRL) کا کارڈ لے کر موجود رہنا چاہیے تھا تاکہ میں فوراً انھیں پالوں اور وہ ہوٹل تک میری رہنمائی کرسکیں۔ مگر جب میں ایرپورٹ سے باہر آیا تو وہاں اس قسم کی کوئی علامت مجھے نظر نہ آئی۔ کچھ دیر کے لیے میں عجیب الجھن میں پڑ گیا۔ ایک صاحب سے ذکر کیا تو انھوں نے ایرپورٹ سے ہوٹل انٹر کانٹی ننٹل کو ٹیلی فون کیا۔

ہوٹل والوں نے بتایا کہ یہاں سے کئی آدمی ریسیو کرنے کے لیے جا چکے ہیں۔ آپ دوبارہ انھیں ایرپورٹ پر تلاش کریں۔ اس کے بعد مزید چل کر دیکھا تو وہ وہاں کارڈ لیے ہوئے میرے انتظار میں کھڑے تھے۔

قصہ یہ تھا کہ وہ لوگ دوسرے گیٹ پر تھے اور میں ایک اور گیٹ سے باہر آیا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ایک مقام پر اپنے مطلوب کو نہ پاکر مایوس ہو جاتا ہے۔ حالاں کہ اگر وہ تلاش کرے تو وہ پائے گا کہ اس کا مطلوب دوسرے مقام پر خود اس کے انتظار میں کھڑا ہوا ہے۔

جنیوا میں میرا قیام انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں تھا۔ میرے کمرہ کا نمبر ۵۲۱ تھا۔ ہوٹل میں جو پبلسٹی لٹریچر رکھا ہوا تھا، اس میں کافی لٹریچر عربی میں بھی نظر آیا "سویسرا" نام کی ایک مکمل گائڈ بک عربی زبان میں موجود تھی۔ اس کے علاوہ مختلف کاغذات پر عربی زبان میں اندراجات نظر آئے۔ مثلاً ایک دوورقہ میں ہوٹل کا تعارف کرایا گیا تھا۔ اس میں لکھا ہوا تھا: اکثر من ۸۰ فندق فخم حول العالم (ساری دنیا میں ہمارے ۸۰ سے زیادہ بڑے ہوٹل ہیں) کمرہ کے باتھ روم میں پلاسٹک کی ایک تھیلی میں نہانے کی ٹوپی (Shower cap) رکھی ہوئی تھی۔ اس کے اوپر مختلف زبانوں میں اندراجات تھے، اسی کے ساتھ اس پر عربی میں غطاء للرأس بھی لکھا ہوا تھا۔ کمرہ میں لمبے شیشے کی کھڑکی پر عربی میں لکھا ہوا تھا:

یرجی قفل النافذة عند تشغیل تکییف الھواء مع الشکر

براہ کرم ایر کنڈیشنر چلانے کے وقت کھڑکی کو بند رکھیں۔ جنیوا میں عرب لوگ کافی آتے ہیں۔ یہ عربیت اسی کی بنا پر ہے۔

ہوٹل کے کمرہ میں ایک بہت عمدہ چھپا ہوا جرنل تھا۔ جس میں تصویروں کے ذریعہ دکھایا گیا تھا کہ اس ہوٹل کو کس قسم کے لوگوں کی میزبانی کا موقع ملتا رہتا ہے۔ ان شخصیتوں میں وزیر اعظم ہندستان راجیو گاندھی، صدر انڈونیشیا جنرل سوہارتو، سلطان بن عبد العزیز (سعودی عرب) اور دوسری بہت سی ممتاز شخصیتوں کے نام شامل تھے۔

یہ ہوٹل مختلف طریقوں سے اپنے اعلیٰ میزبانوں کو متاثر کرتا ہے۔ مثلاً اس کے ایک باتصویر نوٹ میں بتایا گیا تھا کہ جرمنی کا ایک ممتاز شخص (Udo Lattek) اپنی پارٹی کے ساتھ

اس ہوٹل میں ٹھہرا۔ اتفاق سے انھیں تاریخوں میں اس آدمی کی برتھ ڈے تھی۔ ہوٹل والوں نے عین اس تاریخ کو اچانک برتھ ڈے کا کیک اس کو پیش کر کے اسے حیرت میں ڈال دیا :

The Management surprised him with a birthday cake.

تاجر اپنی تجارت میں اسی وقت کامیاب ہوتا ہے جب کہ وہ یک طرفہ اخلاقیات کے ذریعہ اپنے گاہک کے دل کو جیت لے ۔ ایسا ہی کچھ معاملہ دعوت حق کا بھی ہے ۔ حق کے داعی کو بھی یک طرفہ عمل کے ذریعہ مدعو کے دل کو جیتنا پڑتا ہے ۔ اس کے بغیر کسی کے اندر وہ گہرا تاثر پیدا نہیں ہو سکتا جو ایک آدمی کو اپنے راستہ کی تبدیلی پر مجبور کر دے ۔

" سوئزرلینڈ " کے نام سے غالباً سب سے پہلے میں اس وقت واقف ہوا جب کہ ابھی میری کم عمری کا زمانہ تھا اور میرے گھر والوں نے مجھے ایک آٹومیٹک گھڑی پہننے کے لیے دی ۔ اس پر سوئس گھڑی (Swiss Watch) لکھا ہوا تھا ۔ اس سے میرے ذہن پر یہ تصور قائم ہوا کہ سوئزرلینڈ گھڑیوں کا ایک ملک ہے ۔ مگر بعد کی معلومات نے صرف جزئی طور پر اس کی تصدیق کی ۔ بعد کو معلوم ہوا کہ سوئزرلینڈ اسی درجہ میں گھڑیوں کا ملک ہے جس درجہ میں عرب اونٹوں یا کھجوروں کا ملک ۔

میری یہ گھڑی کنجی دیئے بغیر اپنے آپ چلتی تھی ۔ اپنی کم عمری کی بنا پر اس وقت میں نے یہ سمجھا کہ وہ شاید نبض کی حرکت سے چلتی ہے ۔ یہ غلط فہمی اس وقت رفع ہوئی جب کہ کچھ عرصہ بعد گھڑی بند ہو گئی ۔ اس وقت میں نے اس کو ایک گھڑی ساز کو صفائی کیلئے دیا ۔ اس نے کھول کر دکھایا کہ گھڑی کے اندر ایک خاص طرح کا پہیہ نما پرزہ ہے جو ایک تہائی کے بقدر کٹا ہوا ہے ۔ یہ پہیہ ہاتھ کی حرکت سے برابر گھومتا رہتا ہے اور گھڑی کو کوک دیتا رہتا ہے ۔ اس پرزہ کو روٹر (Rotor) کہا جاتا ہے ۔ یہ آٹومیٹک گھڑی کی قدیم تکنیک تھی ۔ اب نئے قسم کی آٹومیٹک گھڑیاں بازار میں ملنے لگی ہیں ۔ کم عمری کے اس واقعہ نے مجھے ہمیشہ کے لیے یہ سبق دیدیا کہ کسی چیز کے بارہ میں محض قیاس سے کوئی رائے قائم نہیں کرنا چاہیے ۔ صحیح رائے وہ ہے جو مکمل معلومات کی بنیاد پر قائم کی جائے ۔

سوئزرلینڈ کے ایک شہر لی لاکل (Le Locle) کے چوراہہ پر ایک نوجوان کا اسٹیچو لگا ہوا ہے ۔ یہ ڈینیل جین ریچرڈ (Daniel Jean-Richard) کا اسٹیچو ہے ۔ وہ ۱۶۶۵ میں پیدا ہوا ۱۷۴۱ میں اس کی وفات ہوئی ۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار گھوڑے کا ایک انگریز تاجر ادھر سے گزرا

اس نے مذکورہ نوجوان کے والد کو اپنی ٹوٹی ہوئی گھڑی مرمت کے لیے دی۔ نوجوان نے منت سماجت کر کے یہ گھڑی اس سے مانگ لی۔ اس چھوٹی سی مشین سے اس کو اتنی دل چسپی ہوئی کہ وہ ایسی ہی ایک نئی مشین بنانے میں لگ گیا۔ ۱۸ مہینے کی لگاتار محنت کے بعد اس نے ویسی ہی ایک نئی گھڑی بنالی۔ اس طرح ۱۷۰۵ میں باقاعدہ طور پر سوئزر لینڈ میں گھڑی کی صنعت قائم ہوئی۔ یعنی عین اس وقت جب کہ ہندستان میں اورنگ زیب عالمگیر کی حکومت (۱۶۵۸-۱۷۰۷) کا آخری زمانہ تھا۔ مذکورہ نوجوان اگرچہ "ترقی یافتہ سوئزر لینڈ" کو دیکھنے کے لیے زندہ نہ رہا، مگر ایک شخص کی قربانی اور ہوش مندی نے پوری قوم کو ایک نئے دور میں داخل کر دیا۔

اب اس معاملہ میں اس کے برعکس مثال لیجئے۔ جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب تلاش ہند (Discovery of India) میں لکھا ہے کہ ہندستان کے مغل امرا بکثرت گھڑیاں استعمال کرتے تھے۔ پرتگالی، اور بعد میں انگریز ہندستان میں یہ گھڑیاں لاتے تھے۔ گھڑیوں کا استعمال مغل امرا کے تکلفات میں شامل تھا۔ تاہم اس وقت کے ہندستان میں نہ کسی نے یہ سمجھنے کی کوشش کی کہ کمانی کی گھڑیاں (Spring clocks) جو یورپی تاجر ہندستان میں لا کر فروخت کرتے ہیں، وہ کیسے بنتی ہیں نہ ایسی گھڑیاں کبھی یہاں بنائی گئیں۔ مغل دور کے ہندستان میں میکانکی رجحان (Mechanical bent) کی یہ کمی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ (صفحہ ۲۷۵)

سوئزر لینڈ ارباب سرمایہ کی پناہ گاہ ہے۔ سوئزر لینڈ کے بینکوں میں کھاتہ کھولنے کے لیے وہ پابندیاں نہیں ہیں جو دوسرے ملکوں میں ہوتی ہیں۔ یہاں ہر آدمی کھاتہ کھول سکتا ہے، خواہ وہ سوئزر لینڈ کا شہری ہو یا نہ ہو۔ مزید یہ کہ یہاں خفیہ کھاتے کھولنے کے نہایت وسیع امکانات ہیں۔ یہاں کے بینکوں میں ایسے کھاتے کھولنے کی سہولت ہے جن سے مطلوبہ رقم صرف خفیہ نمبر یا لفظ بتا کر نکالی جا سکتی ہے۔ ان خفیہ کھاتوں کا علم بینک کے اسٹاف کے دو افراد کو ہوتا ہے۔ دو افراد اس لیے تاکہ اگر ایک شخص موجود نہ ہو تو دوسرا شخص فوراً اس کی تعمیل کر سکے۔

اس نظام نے دنیا بھر کے ارباب دولت (بادشاہوں، سیاسی لیڈروں، صنعت کاروں وغیرہ) کو یہ موقع دے دیا ہے کہ وہ سوئزر لینڈ کے بینکوں میں بھاری رقم کے خفیہ کھاتے کھول سکیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ سوئزر لینڈ کے بینکوں میں جمع شدہ ہندستانی باشندوں کی رقوم تقریباً

ساڑھے تیرہ ارب روپے تک پہونچ چکی ہیں۔

سوئزرلینڈ کے خفیہ کھاتے ناجائز دولت جمع کرنے کا محفوظ ترین ذریعہ بن گیے ہیں۔ ان کھاتوں کے ذریعہ جاسوسوں اور تخریب کاروں کو رقمیں فراہم کی جاتی ہیں۔ اخبارات میں یہ خبر آئی تھی کہ ۱۹۸۵ میں ایران نے سوئزرلینڈ کے بینکوں میں ۱۲ ملین ڈالر جمع کیے اور اس کے ذریعہ سے خفیہ طور پر امریکی ہتھیار خریدا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ امریکی ہتھیار اسرائیل کے راستہ سے ایران پہونچے۔

(ٹائمس آف انڈیا ۲۳ نومبر ۱۹۸۶، صفحہ ۱۶)

ہمارے جہاز میں دوسرے اخبارات ورسائل کے ساتھ امریکہ کا ٹائم میگزین بھی موجود تھا۔ ٹائم نے پچھلے ۱۷ سال میں " ۴۷ کور اسٹوریز" چھاپی ہے۔ اس کی اشاعت ۸ دسمبر ۱۹۸۶ میں اس کی ۴۷ ویں کور اسٹوری تھی۔ یہ ایران کے لیے امریکی ہتھیار کی سپلائی کے بارہ میں تھی اور اس کا عنوان تھا:

A scandal involving arms for Iran

ٹائم کی اس رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ ایران نے سوئزرلینڈ کے بینکوں میں خفیہ کھاتے کھول رکھے ہیں۔ ان کے ذریعہ وہ مغربی ملکوں سے بھاری قیمت دے کر ہتھیار خریدتا ہے۔ ٹائم کے مطابق، اس دوران اسرائیل نے ایران کے ہاتھ ۴۲ ملین ڈالر کے امریکی ہتھیار فروخت کیے۔ یہ ہتھیار امریکہ کی اصل قیمت کے لحاظ سے ۱۲ ملین ڈالر کے تھے۔ اس طرح اسرائیل نے تقریباً ۲۵۰ فی صد زیادہ قیمت وصول کی۔ اسرائیل نے اصل رقم (Exact amount) امریکہ (سی آئی اے) کو ادا کی اور باقی رقم خود رکھ لی:

Israel sold Iran $ 12 million worth of weapons at a price that included a mark-up as high as 250%, or $ 42 million (p 20).

جنیوا کی جس عمارت میں ایران نے ہتھیاروں کا یہ معاملہ کیا، اس کی تصویر ٹائم (۱۵ دسمبر ۱۹۸۶) صفحہ ۱۳ پر دیکھی جاسکتی ہے۔

ایران کے اپنے اعلان کے مطابق امریکہ اور اسرائیل دونوں عالم اسلام کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ ان عظیم تر دشمنوں سے امام خمینی کا اتحاد ہو جاتا ہے، مگر عراق کے صدام حسین سے ان کا

اتحاد نہیں ہوسکتا، جب کہ وہ خود صلح کی اور اتحاد کی پیش کش کر رہا ہو۔ کیسا عجیب ہے وہ اسلام جو موجودہ زمانہ کے مجاہدین اسلام کے حصہ میں آیا ہے۔

۱۹۸۲ میں سوئزرلینڈ کے ۲۷۵ بینکوں میں جو رقم جمع تھی، وہ ہندستانی سکہ میں 305,000 کروڑ روپئے ہوتی ہے (ریڈرز ڈائجسٹ، فروری ۱۹۸۴)

سوئزرلینڈ کا ایک طبقہ بینکوں میں خفیہ کھاتے رکھنے کے خلاف ہے۔ کیوں کہ اس سے ظالم حکمراں اور غلط ذرائع سے دولت حاصل کرنے والے دوسرے لوگ اپنی دولت کو چھپا کر دوبارہ اس کو باعزت طور پر استعمال کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ ایک سوشل ڈیموکریٹ نے بینک رازداری کو ختم کرنے کی وکالت کرتے ہوئے کہا کہ کالا دھن ہمارے بینکوں کے علی بابا کے کھوہ میں غائب ہو جاتا ہے اور پھر وہ جائز دولت بن کر باہر آتا ہے تاکہ اس کو حسب منشا استعمال کیا جا سکے:

Black money disappears into the Ali Baba caves of our banks and emerges respectably white and ready for investment.

سوئزرلینڈ یورپ کا ایک نسبتاً چھوٹا ملک ہے۔ اس کو ساحل سمندر بھی حاصل نہیں۔ مگر سوئزرلینڈ کو اس کی کمیوں نے عمل کا مزید حوصلہ دیا۔ ایک مورخ کے الفاظ میں، خام مواد سے محرومی نے سوئزرلینڈ کو مایوس نہیں کیا۔ اس نے اپنی محنت سے اپنے یہاں نہایت اعلیٰ اور معیاری صنعتی بنیاد تعمیر کرلی۔ حتیٰ کہ وہ یوروپ میں فی کس سب سے زیادہ آمدنی کا ملک بن گیا:

Undismayed by a lack of raw material, the Swiss have constructed a high-quality, high-technology industrial base for Europe's highest per capita income.

سوئزرلینڈ میں چار زبانیں (جرمن، فرنچ، اٹالین، رومانش) رائج ہیں۔ یہاں غیر ملکی کارکنوں کی تعداد نصف ملین ہے (کل تعداد کا ۱۷ فی صد) سوئزرلینڈ کی کل آبادی تقریباً ۶۳ لاکھ ۵۰ ہزار ہے۔ صد فی صد لوگ تعلیم یافتہ ہیں۔

جنیوا زیادہ بڑا شہر نہیں۔ آپ اگر چاہیں تو پیدل چل کر اس کے ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہونچ سکتے ہیں۔ بظاہر دیکھنے میں بھی وہ بہت زیادہ عظیم نظر نہیں آتا۔ تاہم اس کی تاریخ نے اس کو عظیم بنا دیا ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ اکثر بین اقوامی اہمیت کے

واقعات جنیوا میں پیش آئے۔

جنیوا، سرینگر کی مانند پہاڑوں کے درمیان ایک وسیع ہموار میدان میں آباد ہے۔ وہ اپنی بعض خصوصیات کی وجہ سے یوروپ کا ایک ممتاز شہر سمجھا جاتا ہے۔ اس کا رقبہ ۱۱۰ مربع میل (۲۸۰ کلومیٹر) ہے۔ اس کی آبادی تقریباً ۳۲۰ ہزار ہے۔ جنیوا کی معاشی اور تہذیبی اہمیت اپنے رقبہ سے بہت زیادہ ہے۔ سولھویں صدی تک جنیوا تنزل کا شکار رہا۔ اس کے بعد ۱۵۲۰ سے اٹلی، جرمنی، فرانس وغیرہ ملکوں کے نکلے ہوئے لوگ یہاں آکر آباد ہوئے۔ اس سے جنیوا کو نیا خون (New blood) ملا اور اس کی ترقیاں شروع ہوئیں۔ ان لوگوں نے غیر معمولی محنت سے یہاں گھڑی سازی، پرنٹنگ اور دوسرے صنعتی میدانوں میں ملک کو آگے بڑھایا ——

ہر قوم کی ترقی کے لیے "نیا خون" درکار ہوتا ہے، خواہ یہ نیا خون اندر سے حاصل ہو یا باہر سے۔

عیسائیت میں ریفارمیشن کی تحریک نے جنیوا میں اتنی مقبولیت حاصل کی کہ اس شہر کو پروٹسٹنٹ روم (Protestant Rome) کہا جانے لگا۔ جنیوا کی مقامی آبادی میں پروٹسٹنٹ لوگ کسی قدر زیادہ ہیں۔ مگر مجموعی آبادی میں پروٹسٹنٹ اور کیتھولک تقریباً نصف نصف ہیں۔ جنیوا میں میں نے بعض پروٹسٹنٹ چرچ اندر سے دیکھے۔ وہ کیتھولک چرچ کے برعکس، بالکل سادہ تھے۔ جیسے مسلمانوں کی مسجدیں سادہ ہوتی ہیں۔

جنیوا کو ایک بین اقوامی شہر (International city) کہا جاتا ہے۔ یہاں ڈیڑھ سو سے زیادہ بین اقوامی اداروں کے صدر دفتر ہیں۔ اور اکثر بین اقوامی اداروں کی شاخیں موجود ہیں۔ جنیوا کو بین اقوامی حیثیت دینے میں اس کا بھی دخل ہے کہ یہاں تقریباً ۳۵ فی صد بیرونی افراد آباد ہیں۔ اس واقعہ نے جنیوا کو ایک قسم کی عالمی حیثیت دیدی ہے۔ فرانس کے سیاست داں ٹالی رینڈ (Talleyrand) نے کہا تھا کہ دنیا میں پانچ براعظم ہیں اور پھر جنیوا ہے۔

There are five continents, and then there is Geneva.

جنیوا میں دور جدید کے بعض انتہائی بڑے مفکر پیدا ہوئے۔ مثلاً روسو اور والٹیر۔ اس بنا پر جنیوا کو یہ حیثیت بھی حاصل ہوئی کہ وہ اہل علم کی توجہ کا مرکز بن گیا۔

دور اول میں مسلمان جب اسپین کے راستہ سے یورپ میں داخل ہوئے تو وہ پیش قدمی

کرتے ہوئے سوئزرلینڈ تک پہونچ گیے۔ اسپین اور سسلی اور جنوبی اٹلی اور جنوبی فرانس میں انھوں نے باقاعدہ حکومتیں قائم کرلیں۔ تاہم سوئزرلینڈ میں اس قسم کی کوئی حکومت قائم نہ ہو سکی۔

سوئزرلینڈ میں عرب مسلمانوں کے داخلہ کے بارہ میں قدیم عربی کتابوں میں بہت کم معلومات ملتی ہیں۔ اس سلسلہ میں زیادہ معلومات ان کتابوں میں ہیں جو عیسائی حضرات نے جرمن اور فرانسیسی زبانوں میں لکھی ہیں۔ امیر شکیب ارسلان (۱۹۴۶-۱۸۶۹) جرمن اور فرانسیسی زبان جانتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ان کتابوں کا مطالعہ کیا۔ نیز انھوں نے ان یورپی علاقوں کے سفر کیے۔ اس کے بعد انھوں نے اس موضوع پر تین سو صفحات کی ایک کتاب (۱۳۵۲ھ) عربی زبان میں لکھی ہے جس کا نام یہ ہے :

تاریخ غزوات العرب فی فرنسا و سویسرا و ایطالیا وجزائر البحر المتوسط

امیر شکیب ارسلان کی اس کتاب میں دوسری معلومات کے علاوہ ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ انھوں نے اس میں ایک جرمن کتاب کا خلاصہ شامل کر دیا ہے جو خاص اسی موضوع پر لکھی گئی تھی۔ اس کتاب کا جرمن نام یہ ہے :

Der einfall der Sarazenenen in die Schweiz.
Von dr Ferdinand Keller

سوئس انسائکلوپیڈیا *(Dictionnaire historique et biographique de la Suisse)* میں سراسین (Saracen) کے باب کے تحت بھی عربوں کے سوئزرلینڈ میں داخلہ کی بابت کافی معلومات درج ہیں۔

امیر شکیب ارسلان نے اپنی تحقیق کے دوران خود سوئزرلینڈ کا سفر کیا تھا۔ اس سلسلہ میں وہ سوئزرلینڈ کے شہر سیون (Sion) گیے۔ وہاں سے دریافت کرتے ہوئے وہ ایک گاؤں میں پہونچے جو پہاڑوں کے درمیان واقع ہے۔ یہاں ایک بوڑھے واقف کار شخص نے انھیں بتایا کہ ہم سنتے آئے ہیں کہ اس گاؤں کے تمام باشندے یا کم ازکم ان میں سے کچھ عرب نسل سے ہیں (ان اہالی هٰذه القریة او بعضهم علی الاقل هم من اصل عربی، صفحہ ۲۷۹) اس نے مزید بتایا کہ اس طرح کی اور بستیاں بھی سوئزرلینڈ میں پائی جاتی ہیں۔ سوئزرلینڈ کے بعض مقامات کے نام اب بھی عربی انداز

پر ہیں۔ مثلاً علی العین (Allalin) اور الماجل (Almagell) وغیرہ۔

مغربی مورخین نے اپنی کتابوں میں عربوں کے سوئزر لینڈ میں داخلہ کی یہ تصویر پیش کی ہے کہ وہ یہاں لوٹ مار کرنے آتے تھے۔ چنانچہ خود امیر شکیب ارسلان نے اپنی مذکورہ کتاب میں اس طرح کے عنوانات قائم کیے ہیں ——— نزول العرب فی بروفانس وغاراتھم من هنالك علی سافوای وبییمونت، سویسرة، غارات العرب علی سویسرة فی اواسط القرن العاشر۔

پروفیسر ہٹی نے اپنی کتاب (تاریخ عرب) میں سوئزر لینڈ میں قدیم مسلمانوں کے داخلہ کے بارہ میں ایک پیراگراف لکھا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ اغالبہ اپنی پیش قدمی کے دوران صرف اٹلی کے ساحل تک نہیں رکے۔ ۸۶۹ء میں انھوں نے مالٹا کو فتح کر لیا۔ اٹلی اور اسپین سے ان کے حملے دسویں صدی میں الپائن کے دروں کے ذریعہ وسط یورپ تک پہونچے تھے۔ الپ کے علاقہ میں متعدد عمارتیں اور دیواریں ہیں جن کو سیاحوں کی گائڈ بک قدیم مسلمانوں کے حملوں سے منسوب کرتی ہیں۔ سوئزر لینڈ میں کچھ جگہوں کے نام عرب اصل سے تعلق رکھنے والے نظر آتے ہیں، مثلاً گابی اور الگابی جو بظاہر الجابی (محصل) کی بدلی ہوئی صورت ہے:

The Aghlabids did not limit their operations to the Italian coasts. In 869 they captured Malta. From Italy and Spain piratical raids in the tenth century extended through the Alpine passes into mid-Europe. In the Alps are a number of castles and walls which tourists' guides attribute to the invasion of the Saracens. Certain Swiss place-names, such as Gaby and Algaby (al-jabi?, tax collector) which appear in Baedeker's Switzerland, may possibly be of Arabic origin.
Philip K. Hitti, *History of The Arabs*,
Macmillan, London, 1968, p. 605

مسلمان اغالبہ اور فاطمیہ کے دور میں سوئزر لینڈ میں داخل ہوئے۔ مگر یہاں ان کی کبھی حکومت قائم نہ ہوسکی۔ اگرچہ بعض مسلم مصنفین نے یہاں قیام حکومت کا دعوی کیا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب نے اپنی کتاب تعارف اسلام (An Introduction to Islam) میں لکھا ہے کہ عباسی دور میں تیونس کے گورنر کو دعوت دی گئی کہ وہ سسلی کی خانہ جنگی میں مداخلت کرے۔ اس کے بعد تیونس کے مسلم گورنر نے جزیرہ سسلی پر قبضہ کر لیا۔ مزید وہ اٹلی کے بڑے حصہ پر بھی قابض ہوگیا۔ حتی کہ مسلمان

پیش قدمی کرتے ہوئے روم کی دیواروں تک پہونچ گیے۔ اس زمانہ میں فرانس کا جنوبی حصہ اور اسی کے ساتھ سوئزرلینڈ کا قابل لحاظ حصہ بھی مسلم سلطنت میں شامل کرلیا گیا :

The south of France was annexed as also a considerable part of Switzerland (p. 246).

مگر سوئزرلینڈ کے بارہ میں یہ بات تاریخ سے ثابت نہیں ہوتی ۔

دسمبر ۱۹۳۱ میں ایک سفر کے دوران مہاتما گاندھی جنیوا آئے تھے۔ انھوں نے وکٹری ہال (Victory Hall) میں ایک تقریر کی۔ اس کا موضوع تھا: سچائی خدا ہے (Truth is God) اس کا ذکر کرتے ہوئے لوئی فشر نے لکھا ہے کہ لامذہب قسم کے لوگ گھنٹوں تک ان پر سوالات کی بوچھار کرتے رہے۔ مگر مہاتما گاندھی نے کامل سکون کے ساتھ ان کا جواب دیا، ان کے چہرہ کی ایک رگ بھی حرکت میں نہیں آئی :

He was heckled for hours by atheists and others. He answered them in perfect calm, not a muscle of his face twitching.
Louis Ficher, *The Life of Mahatma Gandhi*
Harper Row, New York, 1983, p. 293

موجودہ زمانہ کے بے شمار مسلم لیڈروں میں سے کسی ایک کے یہاں بھی برداشت کی یہ مثال نہیں ملتی، یہی وجہ ہے کہ کسی ایک مسلم لیڈر نے بھی وہ کامیابی حاصل نہیں کی جو مہاتما گاندھی نے موجودہ زمانہ میں حاصل کی ۔

سوئزرلینڈ کی ایک مشہور گھڑی ہے جس کا نام رولکس (Rolex) ہے۔ اس کا اشتہار ایک میگزین میں نظر سے گزرا۔ اشتہار میں گھڑی کے ساتھ ایک فلم پروڈیوسر (Placido Domingo) کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ یہ گھڑی میرے لیے بہترین ہے۔ کیوں کہ میرے طریقہ کے برعکس اس کو کبھی آرام کی ضرورت نہیں :

Because, unlike me, Rolex never needs a rest.

گھڑی ایک بہت چھوٹی چیز ہے، مگر وہ ایک بہت بڑی چیز کی یاد دلاتی ہے۔ اور وہ خدا کا عظیم الشان نظام ہے۔ زمین ہر لمحہ گھومتی ہے، وہ کبھی آرام نہیں کرتی۔ اسی طرح اس دنیا کی تمام

چیزیں ہر آن متحرک ہیں تاکہ وہ انسان کی ضروریات پوری کریں۔ انسان جب سوتا ہے اس وقت بھی کائنات کا کارخانہ اس کے لیے چلتا رہتا ہے اور جب جاگتا ہے اس وقت بھی۔ انسان کو خبر ہو یا نہ ہو وہ اپنے آپ مسلسل حرکت میں ہے تاکہ انسان کی تمام ضرورتیں فراہم کرے۔ کیسا عجیب ہوگا وہ خدا جس نے اس عجیب "کائناتی گھڑی" کو بنا کر کھڑا کر دیا۔

کانفرنس میں مختلف ملکوں کے تقریباً ۸۰ آدمی شریک ہوئے۔ ہر مذہب کے نمائندہ نے اپنے مذہب میں مذہبی آزادی کی اہمیت بتائی۔ پھر مختلف ملکوں میں مذہبی آزادی کی عملی صورت حال پر اظہار خیال ہوا۔ اس کے بعد یورپ، ایشیا، افریقہ، امریکہ کے الگ الگ گروپ بنائے گئے۔ ہر گروپ نے اپنے اپنے براعظم کے اعتبار سے مذہبی آزادی کے مسئلہ پر تبادلۂ خیال کیا۔ اس تبادلۂ خیال کا خلاصہ ایک مختصر رپورٹ کی صورت میں کانفرنس کے عام اجتماع میں پیش کیا گیا۔

موجودہ زمانہ ایک اعتبار سے اجتماعات اور کانفرنسوں کا زمانہ ہے۔ دنیا بھر میں ہر روز مختلف قسم کے اجتماعات ہوتے ہیں۔ ان اجتماعات میں مسلمانوں کی دینی شخصیتوں کو بھی مدعو کیا جاتا ہے مگر مسلمانوں کی دینی شخصیتیں عام طور پر صرف مسلمانوں کے اجتماعات میں شرکت کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ حتیٰ کہ بیرونی ملکوں میں ان کے اسفار بھی صرف وہاں کے بسنے والے مسلمانوں کے درمیان ہوتے ہیں۔

راقم الحروف کے ساتھ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس کو مسلمانوں کے علاوہ بار بار غیر مسلم صاحبان کے اجتماعات میں شرکت اور خطاب کے مواقع ملے ہیں۔ اس سلسلے میں کچھ اجتماعات یہ ہیں:

۱۔	آل مذاہب کانفرنس	بجنور	نومبر ۱۹۵۹
۲۔	وشو دھرم سمیلن	الہ آباد	مئی ۱۹۶۰
۳۔	ورلڈ فیلوشپ آف ریلیجنز	نئی دہلی	فروری ۱۹۶۵
۴۔	انٹرنیشنل سیمینار آن ریلجن	نئی دہلی	دسمبر ۱۹۷۳
۵۔	مسلم کرسچین ڈائیلاگ	طرابلس (لیبیا)	فروری ۱۹۷۶
۶۔	اسمبلی آف دی ورلڈ ریلیجنز	نیویارک (امریکہ)	نومبر ۱۹۸۵
۷۔	کونسل فار دی ورلڈ ریلیجنز	بنگلور	جون ۱۹۸۶
۸۔	ورلڈ کونسل آن ریلجس لبرٹی	جنیوا (سوئزرلینڈ)	دسمبر ۱۹۸۶

۱۔ الرسالہ (انگریزی) کے اجراء اور انگریزی کتب کی اشاعت سے پہلے ہمارے اور غیر اردو داں طبقہ کے درمیان ایک قسم کا مواصلاتی فصل قائم تھا۔ اب خدا کے فضل سے وہ فصل ٹوٹ چکا ہے۔ انگریزی الرسالہ اور انگریزی تراجم کے ذریعہ وسیع تر حلقہ میں اسلامی مرکز کا پیغام مسلسل پہونچ رہا ہے۔ عام انگریزی دانوں کے علاوہ خواص کی طرف سے بھی اس کی اطلاعات برابر ملتی رہتی ہیں۔ حال میں ہم کو ملیشیا کے پرائم منسٹر ڈاکٹر مہاتیر بن محمد (Dr. Mahathir Bin Mohammad) کا خط مورخہ ۲۷ نومبر ۱۹۸۶ ملا ہے انھوں نے صدر اسلامی مرکز کی کوششوں کو سراہتے ہوئے لکھا ہے :

I scanned through the book 'Mohammad: The Prophet of Revolution' and find it very lucid and interesting. My congratulations to you on your contribution to Islamic thought.

۲۔ الرسالہ کو اللہ تعالیٰ ایسے عجیب طریقوں سے پھیلا رہے ہیں کہ بیشتر طور پر اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر ایک صاحب ظہران (سعودی عرب) سے اپنے خط ۴ دسمبر ۱۹۸۶ میں لکھتے ہیں کہ میرا تاثر یہ ہے کہ الرسالہ کا انداز فطرت کے عین مطابق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو کوئی بھی اس کو ایک مرتبہ دیکھ لیتا ہے، متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ دو دن پہلے کی بات ہے، میں پوسٹ بکس سے الرسالہ انگریزی لیے چلا آرہا تھا۔ لفٹ میں اس کو دیکھ رہا تھا کہ ایک صاحب کی نظر اس کے پہلے صفحہ پر پڑی جس میں لکھا ہوا تھا :

What is sympathy. Sympathy is your pain in my heart.

ان صاحب نے اس کو دیکھ کر فوراً کہا :

Where from you get this magazine?

میں نے یہ سن کر فوراً انھیں وہ رسالہ دے دیا اور طریقہ بتا دیا کہ آپ اس طرح اس کو انڈیا سے منگا سکتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ الرسالہ ضمیر میں ایک قسم کا بھونچال مچا دیتا ہے اور آدمی اس کی ہر تحریر کا تقابل اپنے آپ سے کرنے لگتا ہے۔ میرے لیے الرسالہ بہت مددگار ثابت ہوا ہے۔ میرے سوچنے کے انداز کا رُخ بدل چکا ہے۔ (محمد مختار)

۳- اسلامی مرکز کا مشن اللہ کے فضل سے دن بدن وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ اس کا اظہار مختلف صورتوں میں ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ ہر طبقہ کے لوگ مرکز کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ ۲۸ نومبر ۱۹۸۶ کو کناڈا کے ایک پروفیسر (Dr M. Darrol Bryant) اسلامی مرکز میں آئے اور کئی گھنٹے تک صدر اسلامی مرکز سے تبادلہ خیال کیا۔ انھوں نے اسلامی مرکز کی انگریزی مطبوعات اور الرسالہ (انگریزی) کے بارہ میں غیر معمولی پسندیدگی کا اظہار کیا۔

۴- الرسالہ اپنے قارئین میں کس قسم کا ذہن بنا رہا ہے، اس کا اندازہ مختلف طریقوں سے ہوتا رہتا ہے۔ ایک صاحب اپنے خط (۹ دسمبر ۱۹۸۶) میں لکھتے ہیں کہ حسن پور میں بہت سے لوگ الرسالہ کی آمد کا بے چینی سے انتظار کرتے ہیں۔ اور میرے بہت سے دوست اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کی عمر دراز فرمائے۔ آپ نے ہمیں اسلام سے متعارف کیا ہے۔ ہمیں محبت کرنا سکھایا ہے۔ الرسالہ کا پڑھنے والا کوئی بھی کسی سے نفرت نہیں کرتا۔ یہ آپ ہی کی دین ہے۔

۵- ناندیڑ سے مولانا عبد القدیر صاحب لکھتے ہیں کہ "یہاں قارئین الرسالہ کی تعداد مسلسل بڑھتی جا رہی ہے۔ ۳۰ نومبر ۱۹۸۶ کو قارئین الرسالہ کا ایک اجتماع ہوا۔ اس اجتماع کا عنوان تھا: موجودہ دور میں الرسالہ کی اہمیت و افادیت۔ ناندیڑ کے علاوہ دوسرے قریبی مقامات کے لوگ بھی اس میں شریک ہوئے۔ یہ اجتماع توقع سے زیادہ کامیاب رہا۔ ہم نے محسوس کیا کہ کم از کم فکری اور نظریاتی طور پر بہت سے لوگ بلکہ بہت سے علما اس تحریک سے متفق ہو رہے ہیں"۔

۶- الرسالہ (نومبر ۱۹۸۶) میں "ایک تقاضا" کے عنوان کے تحت ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ آج یہ ضرورت ہے کہ اسلام کے شرعی قانون کو وقت کے علمی اور عقلی معیار پر مدلل کر کے پیش کیا جائے۔ اس سلسلہ میں قارئین الرسالہ کی طرف سے متعدد خطوط موصول ہوئے ہیں کہ اس ضرورت کی تکمیل کے لیے اسلامی مرکز نے کیا کیا ہے۔ اطلاعاً عرض ہے کہ صدر اسلامی مرکز نے اس سلسلہ میں کافی تحقیق اور جد و جہد کے بعد خاص اس موضوع پر ایک کتاب تیار کی ہے، جو "خاتون اسلام" کے نام سے چھپ گئی ہے۔

۷۔ قارئین الرسالہ کی طرف سے مختلف قسم کے سوال نامے مرکز میں آتے رہتے ہیں اور صدر اسلامی مرکز ان کا جواب دیتے ہیں۔ اس قسم کے ایک سوال نامہ کا جواب اگلے صفحہ پر نقل کیا جارہا ہے۔ آئندہ بھی انشاء اللہ اس قسم کا سلسلہ جاری رہے گا۔

۸۔ ایک صاحبِ ایجنسی نے اطلاع دی ہے کہ ان کے ذریعہ سے جو لوگ الرسالہ خرید رہے تھے، ان میں سے کچھ افراد نے خریداری بند کر دی۔ صاحبِ ایجنسی کو فوری طور پر خیال ہوا کہ اس کے بقدر ایجنسی کی تعداد میں کمی کر دیں۔ مگر بعد کو ان کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ دفتر کو خط لکھنے سے پہلے نئے افراد کے اندر خریدار تلاش کرنے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ انھوں نے نئے لوگوں کو الرسالہ دکھایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کئی نئے خریدار بن گئے۔ حتی کہ انھیں اپنی ایجنسی میں الرسالہ کی تعداد کم کرنے کے بجائے اس کی تعداد میں اضافہ کا خط دفتر الرسالہ کو لکھنا پڑا۔ یہ ایک مفید تجربہ ہے۔ دوسرے صاحبانِ ایجنسی کو بھی اپنے حلقہ میں اس کا تجربہ کرنا چاہیے۔

۹۔ ایک صاحب لکھتے ہیں" پیغمبر انقلاب" بدست ہوئی۔ جس کے مطالعہ نے پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کا بہترین نقش میرے ذہن پر چھوڑا۔ اس سے قبل سیرت پاک پر مولانا شبلی نعمانی کا پہلا حصہ پڑھا تھا۔ جس سے حضور پاک کی عملی زندگی کا پورا خاکہ ذہن میں آگیا تھا۔ تاہم آپ کی تصنیف نے علمی اور تاریخی پیرائے میں جن واقعات کی تشریح کی وہ قابل مبارکباد ہے۔ الرسالہ کے مسلسل مطالعہ سے یہ بات مجھ پر خصوصی طور پر واضح ہو چکی ہے کہ آپ کا اندازِ فکر قرآن کے مطلوب انسان کی مکمل ترجمانی ہے۔ یہ مسلمانوں سے منفی نفسیات کو چھوڑ کر مثبت ردعمل اپنانے کی دعوت دیتا ہے۔ آپ کا مشن وہی ہے جس کو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اسوۂ حسنہ میں ظاہر فرمایا۔ بخدا آپ کی تصنیفات پڑھنے کے بعد زندگی میں نئی تازگی، اُمنگ اور جینے کا ولولہ پیدا ہوا ہے۔ اسلام اور قرآن کے تعلق سے جتنے شکوک و شبہات تھے رفتہ رفتہ دور ہو رہے ہیں۔ اسلام کو علمی اور فلسفیانہ انداز میں پیش کرنے کی کم ہی کوشش کی گئی ہے۔ میری طرح سائنس کے طالب علم جو ہر بات کو تجربہ اور ریسرچ کے پیمانہ میں دیکھنے کے عادی ہیں اور ہمارا تعلیمی نظام جو سیکولر ذہن بناتا ہے۔ ایسے حالات میں آپ کا لٹریچر بہت مفید ہے۔ (دربھنگہ، ۷ جون ۱۹۸۶)

مکرمی جناب حکیم عبدالقوی صاحب، لکھنؤ   السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

آپ کا خط مورخہ ۲۷ نومبر ۱۹۸۶ ملا۔ آپ نے میرے بیان کی تردید میں تین مسلمانوں کی مثالیں پیش کی ہیں جنھوں نے قرآن کو مسز اندرا گاندھی کے سامنے "تحفۃً" پیش کیا تھا۔ عرض ہے کہ آپ نے الرسالہ نومبر ۱۹۸۶ کا صفحہ ۴۲-۴۳ غالباً زیادہ غور سے نہیں پڑھا ورنہ آپ کو معلوم ہو جاتا کہ میں نے جو لکھا ہے کہ کسی مسلم قائد نے مسز اندرا گاندھی کے سامنے خدا کی کتاب پیش نہیں کی۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی نے بطور تحفہ قرآن پیش نہیں کیا۔ بلکہ واضح طور پر میری مراد یہ ہے کہ قرآن کو جس طرح پیش کرنا تھا اس طرح پیش نہیں کیا۔

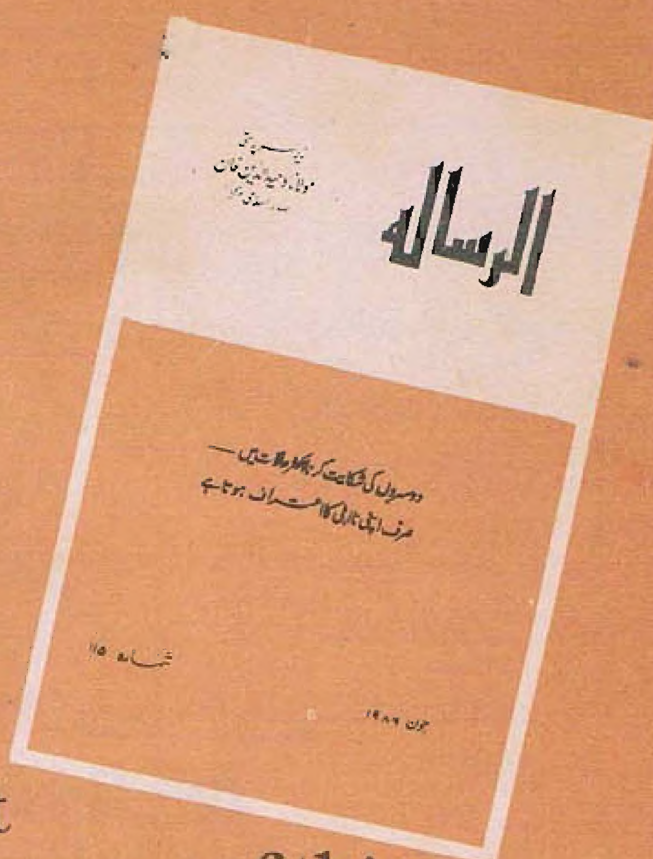
ایک کتاب جب کسی کو دی جائے تو سب سے پہلا سوال یہ ہوتا ہے کہ پانے والا شخص واقعی معنوں میں اس کو لائق مطالعہ سمجھے، دینے والا اس کتاب کے حق میں تجسس کی فضا پیدا کر سکے۔ مسٹر پریم نارائن گپتا کے ہاتھ میں جب اندرا گاندھی نے مسلمانوں کی مذہبی کتاب قرآن کو دیکھا تو "پریم نارائن گپتا" کا نام ہی تجسس پیدا کرنے کا سبب بن گیا۔ مگر جب دینے والا "عبدالرحیم" ہو تو صرف نام مطلوبہ تجسس پیدا کرنے کے لیے کافی نہیں۔ ایسی حالت میں لازمی طور پر کچھ مزید چیزوں کی ضرورت ہوگی۔

۱۔ ہندستان کے مسلمانوں نے اس ملک میں مسلسل جو قومی سیاست اختیار کر رکھی ہے اس کے نتیجہ میں وہ اس ملک میں صرف "مانگنے والی قوم" بن کر رہ گئے ہیں۔ اس ملک کے غیر مسلموں کی نظر میں مسلمانوں کی یہ تصویر باقی نہیں رہی ہے کہ ان کے پاس کوئی ایسی چیز بھی ہے جسے وہ دوسروں کو دے سکیں۔ مسلمانوں کو سب سے پہلے یک طرفہ قربانی کے ذریعہ اپنی اس تصویر کو بدلنا ہوگا۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ ان کی دی ہوئی کتاب غیر مسلم صاحبان کو قابل مطالعہ کتاب نظر آئے۔

۲۔ دوسری چیز فرد سے متعلق ہے۔ اس سلسلہ میں براہ کرم میری مطبوعہ تحریر کے ان الفاظ کو دوبارہ پڑھیں: "مسلم قائدین میں سے کوئی ایک بھی قائد نہیں جس نے ایسا کیا ہو کہ وہ اپنی رات کی تنہائیوں میں نمازیں پڑھ کر مسز اندرا گاندھی کی ہدایت کے لیے دعا کرے۔ صبح کو اٹھ کر وہ دو رکعت صلوٰۃ الحاجۃ پڑھے اور رو رو کر اللہ سے مدد کی درخواست کرے۔ اس کے بعد وہ قرآن کا ترجمہ لے کر مسز اندرا گاندھی کے یہاں جائے اور درد و سوز کے انداز میں ان سے گفتگو کر کے انھیں خدا کی کتاب پیش کرے۔" یہ آخری کم سے کم بات ہے جو کسی مسلمان فرد کو قرآن پیش کرنے والا بناتی ہے۔ اگر یہ آخری بات بھی نہ پائی جائے تو قرآن کو بطور تحفہ پیش کرنا موجودہ حالت میں صرف ایک مذاق ہے۔ اس کو خدا کی کتاب پیش کرنے کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ (۲۶ دسمبر ۱۹۸۶)

D(SE) 243 R.N. No. 28822/76 February 1987 No. 123

GIFTING The Word of God



To spread the word of God is the highest form of charity. It appeals to the mind, the heart, the soul, that being the earnest endeavour of this magazine, how noble-spirited it would be of you, dear readers, if you sent it on regularly to friends and relatives. Make a **GIFT** of it. Think of a whole year's subscription as being both a delightful present as well as a contribution to a worthy cause.

Please send AL-RISALA to my friend/ relative to the following address:

Name ....

Address ....

....

....

(Please use separate sheet for more than one address)

I am enclosing cheque/Postal Order/ Bank Draft/M.O. Receipt No. ....

Please tick box where applicable

☐ URDU
☐ ENGLISH
☐ ONE YEAR
☐ TWO YEARS

Annual Subscription Rates

INLAND	RS. 48
ABROAD	
By air-mail	$ 20
By surface mail	$ 10

Please send this together with the payment to the Circulation Manager ALRISALA C-29 Nizamuddin West New Delhi 110 013

GIFT AL-RISALA TO YOUR FRIENDS & RELATIVES

Rs 4